اُردو

گیارہویں جماعت کی درسی کتاب

(Class - 11)

مادھیمک شکشا پریشد، اتر پردیش

پریاگ راج

Rs. 17.00

راجیو پراکشن - پریاگ راج

تشکیل کمیٹی برائے نصابی کتب

زیر سرپرستی:

جناب **دیپک کمار**، اپر چیف سکریٹری، سکنڈری ایجوکیشنل، حکومت اتر پریش۔

زیرِ نگرانی:

ڈاکٹر **مہیندر دیو**، ڈائرکٹر آف ایجوکیشن (سکنڈری)، اترّ پردیش، لکھنؤ۔

کنوینر:

جناب **دِبیہ کانت شکلا**، سکریٹری، سکنڈری ایجوکیشن، بورڈ، اترّ پردیش، پریاگ راج۔

کوکنوینر:

جناب **اشوک کمار گپتا**، ایڈیشنل سکریٹری، (پا. پو. را)، سکنڈری ایجوکیشن، بورڈ، اترّ پردیش، پریاگ راج۔

محترمہ **شردھا شکلا**، ڈپٹی سکریٹری، سکنڈری ایجوکیشن، بورڈ، اترّ پردیش، پریاگ راج۔

محترمہ **منیشا کشواہا**، اسسٹنٹ سکریٹری، سکنڈری ایجوکیشن بورڈ، اتر پردیش، پریاگ راج۔

مجلس مشاورت:

1۔ ڈاکٹر **ظفر اللہ انصاری** (اسسٹنٹ پروفیسر) شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، پریاگ راج، اتر پردیش۔
2۔ ڈاکٹر **محمد کاشف** (اسسٹنٹ پروفیسر) شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، پریاگ راج، اتر پردیش۔
3۔ ڈاکٹر **فاضل احسن ہاشمی** (اسسٹنٹ پروفیسر) شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ، اتر پردیش۔
4۔ ڈاکٹر **نفیس احمد** (اسسٹنٹ پروفیسر) شعبۂ اردو، سی. ایم. پی. ڈگری کالج، پریاگ راج، اتر پردیش۔
5۔ ڈاکٹر **جگدمبا دوبے** (اسسٹنٹ پروفیسر) شعبۂ اردو، حلیم مسلم پی. جی. کالج، کانپور، اتر پردیش
6۔ ڈاکٹر **شبنم رضوی** (ایسوسیٹ پروفیسر) شعبۂ اردو، کرامت حسین مسلم گرلس پی جی کالج لکھنؤ، اتر پردیش۔
7۔ ڈاکٹر **طاہرہ پروین** (اسسٹنٹ پروفیسر) شعبۂ اردو، ایس. ایس. کھنّا ڈگری کالج، پریاگ راج، اتر پردیش۔

مجلس تصنیف و تالیف:

1۔ جناب **ابوبکر خاں** (لکچرار) سی۔اے۔وی۔انٹر کالج، پریاگ راج۔

2۔ جناب **محمد ارشد** (لکچرار) جی۔آئی۔سی۔، پریاگ راج۔

3۔ جناب **عبدالحکیم** (لکچرار) مجیدیہ اسلامیہ انٹر کالج، پریاگ راج۔

4۔ ڈاکٹر **اجے مالوی** (لکچرار) اینگلو بنگالی انٹر کالج، پریاگ راج۔

5۔ محترمہ **خولہ ناز** (لکچرار) حمیدیہ گرلس انٹر کالج، پریاگ راج۔

6۔ جناب **احسان احمد** (لکچرار) سینٹ اینڈ روج، انٹر کالج، گورکھپور۔

7۔ ڈاکٹر **شمامہ عابدی** (لکچرار) کراسٹھویٹ انٹر کالج، پریاگ راج۔

8۔ محترمہ **شائستہ انجم** (لکچرار) راجکیہ ابھینو ودیالیہ، داندوپور، چاکا، پریاگ راج۔

9۔ ڈاکٹر **عصمت نیلو انصاری** (لکچرار) جی۔جی۔آئی۔سی۔ پرتاپ گڑھ۔

10۔ محترمہ **ثنا صدیقی** (لکچرار) پتراچار شکشا سنستھان، پریاگ راج۔

11۔ ڈاکٹر **عبدالحی** (لکچرار) ضلع شکشا و پراشکشن سنستھان، پریاگ راج۔

12۔ محترمہ **شائستہ اقبال** (لکچرار) ضلع شکشا و پراشکشن سنستھان،، فتح پور۔

13۔ ڈاکٹر **شکیل فاطمہ** (اسسٹنٹ ٹیچر) حمیدیہ گرلس انٹر کالج، پریاگ راج۔

14۔ محترمہ **شبانہ انجم** (اسسٹنٹ ٹیچر) جی.آئی.سی.، پریاگ راج۔

کوآرڈینیٹر:

محترمہ **بندو یادو،** لٹریری اسسٹنٹ، مادھیمک شکشا پریشد، اتر پردیش، پریاگ راج۔

محترمہ **سنگیتا یادو،** لٹریری اسسٹنٹ، مادھیمک شکشا پریشد، اتر پردیش، پریاگ راج۔

پورٹریٹ:

آشیس نرائن

پیش لفظ

اردو ہمارے ہندوستان کی ان زندہ زبانوں میں سے ہے جس کا دائرہ نہایت ہی وسیع ہے۔ اردو کے بولنے والے سارے ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔ اس کا ادبی سرمایہ بھی وقیع و وسیع ہے۔ اس نے ہماری مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ ریاستِ اتر پردیش کو ابتدا ہی سے اس زبان کا گہوارہ ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔ یہاں کے ادبا اور شعرا نے اس زبان کی آبیاری میں اپنا خونِ جگر صرف کر کے اس کو بامِ عروج تک پہنچایا ہے۔ عوامی سطح پر بھی یہ زبان کافی مقبول رہی ہے اور اس کی مقبولیت کا خیال رکھتے ہوئے اس کو اتر پردیش کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا اور اس کی ترویج و اشاعت اور عروج و ترقی پر خصوصی توجہ دی گئی۔ کسی بھی ملک کی ترقی اس کے تعلیمی و تدریسی معیار پر منحصر ہوتی ہے۔ جس ملک کا تعلیمی معیار جتنا بلند اور برتر ہوگا وہ ملک اتنا ہی ترقی یافتہ ہوگا لہٰذا تعلیمی معیار کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے حکومتیں ہمیشہ کوشاں رہی ہیں ''جدید نظریۂ تعلیم 2020'' میں مختلف مضامین کے ساتھ ساتھ زبان کو وقیع و وسیع بنانے پر زور دیا گیا ہے۔ اسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے 2022ء میں اتر پردیش حکومت کی جانب سے ایک نصابی کمیٹی عمل میں آئی جس نے جدید تعلیمی تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نویں، دسویں، گیارہویں اور بارہویں جماعتوں کے نصاب پر غور و فکر کرتے ہوئے اپنی تجاویز پیش کیں جن میں اس نکتے کی طرف اشارہ کیا گیا کہ این.سی.ای.آر.ٹی. کے نصاب اپنائے جانے کی وجہ سے مقامی شعرا و ادبا کی تخلیقات نصاب سے خارج ہو جائیں گی۔ اس لیے ایس.سی.ای.آر.ٹی. نے یہ فیصلہ کیا کہ ماہرین زبان و ادب اور اساتذہ کی ایک کمیٹی کے ذریعے این.سی.ای.آر.ٹی. کے طرز پر کتابیں شائع کرائی جائیں۔ ان کتابوں کے تیار کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ مذکورہ کتابوں کے

مشمولات طلبہ اور طالبات کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہوں اور ان کتابوں کی مدد سے وہ صحیح اردو بولنا، پڑھنا اور لکھنا سیکھ سکیں، اس کے علاوہ اُن کے اندر زبان کی محبت اور ادب کا ذوق بھی پروان چڑھ سکے۔ ان کتابوں سے ہمارے طلبہ وطالبات میں فکر وشعور، تنقیدی نقطۂ نظر اور تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ان میں انسانی قدروں کے تئیں احترام کا جذبہ بھی پیدا ہو۔

مذکورہ مقاصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے کئی مرحلوں میں اردو ورکشاپ کا انعقاد عمل میں آیا جس میں مرکزی و ریاستی سطح کے مختلف اداروں سے متعلق اساتذہ شریک ہوئے اور کتابوں کی از سرِ نو تحریر و تالیف، ترتیب، تدوین اور نظرِ ثانی کا عمل سر انجام دیا۔ ان کتابوں میں نصاب اور امتحان کے طریقوں کے سبھی پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مشقی سوالات میں تنوع رکھا گیا ہے اور اسباق دلچسپ بنانے کی غرض سے شعرا اور ادبا کی تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں۔ اس ورکشاپ میں بورڈ کے تمام اراکین نے بڑی محنت، لگن اور پوری دلچسپی سے اس کام کو تکمیل تک پہنچایا جس کے لیے وہ قابلِ تعریف و تحسین ہیں۔ اتر پردیش مادھیمک شکشا پریشد ان تمام ارکان و شرکا کا شکریہ ادا کرتا ہے جنھوں نے ان کتابوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں اپنا قیمتی تعاون پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر مہیندر دیو

ڈائریکٹر (مادھیمک)/ چیئرمین

مادھیمک شکشا پریشد، اتر پردیش

پریاگ راج

فہرست

حصہ نثر

نمبر شمار	مصنفین	عنوانات	صفحہ نمبر
1	مرزا اسداللہ خاں غالبؔ	منشی میاں داد خاں سیاح کے نام	12
		منشی ہرگوپال تفتہ کے نام	
2	سرسید احمد خان	ترقی علم انشا	21
3	مولوی نذیر احمد	ایک انگریز حاکم سے ملاقات	31
4	عبدالحلیم شرر	لکھنؤ میں فنون ادبیہ کی ترقی	43
5	پنڈت رتن ناتھ سرشار	مصاحبوں کی نوک جھونک	52
6	پریم چند	روشنی	62
7	مولانا عبدالماجد دریابادی	اکبرؔ کی شاعری کا معاشرتی و اخلاقی پس منظر	78
8	مرزا فرحت اللہ بیگ	ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ سے ملیے	91
9	قاضی عبدالغفار	عروس البلاد	103
10	رشید احمد صدیقی	جگر صاحب	113
11	پطرس بخاری	سنیما کا عشق	126
12	کنھیا لال کپور	بے تکلفی	137

حصہ شعر و نظم

نمبر شمار	شعرا	مشمولات	صفحہ نمبر
		1- غزل (تبصرہ)	146
1	مرزا محمد رفیع سوداؔ	I- ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا	147
		II- جی تک تو دے کے لوں کہ تو ہو کار گر کہیں	
		III- گدا دستِ اہلِ کرم دیکھتے ہیں	
2	شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ	I- اسے ہم نے بہت ڈھونڈا، نہ پایا	156
		II- بلبل ہوں صحنِ باغ سے دور اور شکستہ پر	
		III- وقتِ پیری شباب کی باتیں	
3	مرزا اسد اللہ غالبؔ	I- رات دن گردش میں ہیں سات آسماں	164
		II- درد منت کشِ دوا نہ ہوا	
		III- آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک	
4	مومن خاں مومن	I- اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا	171
		II- اس وسعتِ کلام سے جی تنگ آ گیا	
		III- ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم	

5	آرزوؔ لکھنوی	I- جو سخن اس زبان سے نکلا	178
		II- بہت دل لبھایا دل آزار ہو کر	
		III- جو سامنے اب تک آئے نہیں، کیوں دھیان میں آئے جاتے ہیں	
6	ریاض خیرآبادی	I- ہنگامِ نزع گریہ یہاں بے کسی کا تھا	185
		II- ہمارے شیشہ وساغر ہیں یہ مہ وخورشید	
		III- ہو کے آزادتہِ دامن صیاد رہے	
7	حسرت موہانی	I- سرگرم ناز آپ کی شانِ جفا ہے کیا	192
		II- اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم	
		III- وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں	
8	جگر مرادآبادی	I- کس نظر سے آج وہ دیکھا کیا	199
		II- عشق کی یہ نمودِ پیہم کیا؟	
		III- مر کے بھی کب تک نگاہِ شوق کو رسوا کریں	
9	فراقؔ گورکھپور	I- تقدیر منزلوں کی جگاتے چلے چلو	206
		II- وسعت بے کراں میں کھو جائیں	
		III- اسیرانِ ستم نے اور ہی کچھ سوچ رکھا ہے	
		2- مثنوی	213
1	**میر حسنؔ**	داستان حالت تباہ کرنے ماں باپ کی شاہ زادے کے غائب ہونے پر	215
2	شوق قدوائی	طوطا اڑ جانے پر افسوس	222

3	حفیظ جالندھری	صحرا کی دعا	228
		3- قصیدہ	233
1	مرزا اسداللہ خاں غالب	قصیدہ در مدح بہادر شاہ	234
2	امیر مینائی	در مدح نواب کلب علی خاں بہادر والیِ رام پور	244
3	منیر شکوہ آبادی	در تہنیت غسل صحت نواب تجمل حسین خاں فرخ آباد	253
		4- مرثیہ	261
1	میر انیسؔ	حضرت امام حسینؑ کا حضرت عباس کو علم سونپنا	263
2	مرزا دبیرؔ	تلوار کی کاٹ	274
		شہادت حضرت امام حسین	
3	چکبست لکھنوی	مرثیہ گوکھلے	283
4	جوش ملیح آبادی	'آوازۂ حق' سے ایک اقتباس	291
		6،5- قطعات ورباعیات	301
1	مولانا الطاف حسین حالی	اسراف اور بخل	302
2	شبلی نعمانی	غربا نوازی	307
3	ڈاکٹر محمد اقبال	مستیِ کردار، نصیحت	312
4	اختر انصاری	فطرت	317
5	مولانا الطاف حسین حالی	رباعی	321
6	اکبر الہ آبادی	رباعی	327
7	جوش ملیح آبادی	رباعی	333

8	فراق گورکھپوری	رباعی	338
		7- جدید نظم	342
1	نظیر اکبرآبادی	میلے کی سیر	343
2	اکبرالہ آبادی	رنگِ زمانہ	349
3	ڈاکٹر محمد اقبال	سیرِ فلک	355
4	جوش ملیح آبادی	البیلی صبح	361
5	احسان دانش	وادیِ کشمیر کی ایک صبح	367
6	صفی لکھنوی	بہار	372
7	سیماب اکبرآبادی	تاج شب تاریک میں	379
	ضمیمہ		384
	اصناف نثر	خطوط،انشائیہ،ناول،افسانہ،خاکہ	385
	اردو قواعد		391

حصہ نثر

(1)

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

[پیدائش 1797ء، وفات 1869ء]

مرزا غالبؔ کا شمار اردو کے عظیم شاعروں اور نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔ اردو ادب میں علمی نثر کی ابتدا سرسید سے ہوتی ہے، لیکن جدید اردو نثر کی بنیاد خطوطِ غالب سے ہی پڑی۔ غالبؔ کے خطوط اردو ادب کا بیش قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان خطوط نے انھیں اردو نثر میں زندۂ جاوید بنا دیا۔

مرزا غالبؔ کا اصل نام اسد اللہ خاں اور مرزا نوشہ لقب تھا۔ پہلے اسدؔ تخلص کرتے تھے بعد میں غالبؔ تخلص اختیار کیا۔ مغل دربار کی طرف سے نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ شاہی خطاب عطا ہوئے۔ مرزا غالبؔ 1797ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان ایران کا تھا جس کا سلسلۂ نسب افراسیاب بادشاہ توران تک پہنچتا ہے۔ ان کے دادا

بادشاہ شاہ عالم کے وقت دہلی آئے تھے اور انھیں حسب حال اعزاز و اکرام سے نوازا گیا۔

ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ نے ایک متلون زندگی بسر کی۔ ملازمت کے سلسلے میں مختلف مقامات پر رہے، پہلے دربار اودھ اور پھر حیدرآباد دربار سے وابستہ رہے۔ بعد میں الور کے راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت اختیار کی۔ یہاں کسی لڑائی میں مارے گئے۔ اس وقت مرزا غالبؔ کی عمر پانچ برس تھی۔ اس کے بعد ان کے چچا نصر اللہ بیگ نے ان کی سرپرستی کی۔ غالبؔ ابھی نو برس کے تھے کہ ان کے چچا کا بھی انتقال ہو گیا۔ انگریزی سرکار کی طرف سے مرحوم کے وارثوں کو پنشن مقرر ہوئی جس سے سات سو روپیہ سالانہ مرزا کو بھی ملتے تھے۔ بعد میں مغل دربار میں باریابی حاصل ہوئی۔ 1854ء میں استاد ذوق کے انتقال کے بعد مرزا غالب بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے استاد ہو گئے اور ان کے کلام پر اصلاح دینے لگے۔ بہادر شاہ ظفر نے غالب کو پچاس روپیہ ماہوار اور خلعت مقرر کئے۔ لیکن 1857ء میں سقوط سلطنت کے بعد یہ تنخواہ بھی بند ہو گئی اور ان کی زندگی نہایت تکلیف میں بسر ہونے لگی۔ مجبوراً رامپور چلے گئے اور یہاں انھیں ایک سو روپیہ ماہوار مقرر ہو گیا جو تا عمر انھیں ملتا رہا۔ لیکن وطن کی محبت نے انھیں وہاں بھی چین سے رہنے نہ دیا۔ دہلی واپس آ گئے۔ غدر کے ایام میں سلسلہ ملازمت اور شاہی تقرب کی وجہ سے مرزا غالب مصائب میں مبتلا ہو گئے۔ انگریزوں کی نظروں میں انھیں مشکوک بنا دیا اور ان کے چال چلن اور شخصیت و کردار کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ آخر میں بہرامی دوڑ دھوپ کے بعد جب پوری صفائی ہو گئی اور ان کی بے گناہی ثابت ہوئی تو ان کی پرانی پنشن بحال ہوئی اور سابقہ عزت بحال کر دی گئی۔

غالبؔ کی زندگی سراسر المیہ اور دکھ بھری داستان تھی، تمام عمر پریشانی اور تنگ دستی میں مبتلا رہے۔ اس کی خاص وجہ ان کی امیرانہ طرز زندگی تھی۔ اس کے علاوہ انھیں اپنے حسب و نسب، شاعرانہ مرتبے اور علمی حیثیت پر بے جا ناز تھا۔ وہ جس طرح کی شاہانہ زندگی گزارنے کے خواہش مند تھے پوری عمر ہمیشہ انھیں مفلوک الحال اور تنگ دست رکھا۔ 15/ فروری 1869ء کو اردو کے اس مایہ ناز شاعر کی زبان ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔

مرزا غالبؔ کو شاعری اور نثر نگاری میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ ان کی عظمت کا راز صرف ان کی شاعرانہ حسن و بیان کی خوبی میں نہیں ہے، بلکہ نثر نگاری میں بھی ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ وہ جتنے بڑے شاعر ہیں اتنے بڑے نثر

نگار بھی۔ ان کا مکمل نثری سرمایہ خطوط پر مشتمل ہے، جس کے دو مجموعے ''عود ہندی'' اور ''اردوئے معلّٰی'' کے نام سے شائع ہو کر مقبول عام ہو چکے ہیں۔ سلیس و سادہ اندازِ بیان، عام فہم اسلوب تحریر، دل کشی و برجستگی، اثر آفرینی، شوخی و ظرافت، مزاج کی چاشنی اور مراسلہ کو مکالمہ بنا دینے کا ہنر ان کے خطوط کے نمایاں اوصاف ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے خطوط ان کی سیرت و شخصیت کی آئینہ دار اور اس زمانے کی سیاسی، سماجی اور ادبی صورت حال کی عکاسی ہے۔

منشی میاں دادخاں سیاح کے نام

منشی صاحب! تمھارے خط پہنچنے کی تم کو اطلاع دیتا ہوں اور مطالب متفسرہ کا جواب لکھتا ہوں اور اپنے دوست روحانی مرزا رجب علی بیگ سرورؔ کو سلام کہتا ہوں۔ کہہ دیجیے گا، بلکہ یہ رقعہ دکھا دیجیے گا۔

بعض لوگ ''آن بان'' بولتے ہیں، مگر فقیر کے نزدیک ''آن تان'' صحیح ہے اور یہی فصیح ہے۔ ''پر'' بہ معنی 'لیکن' لفظ مشہور ہے اور ''پہ'' اس کا مخفف ہے۔ اس میں شاید کسی کو کلام نہ ہو، کوئی لکھے یا نہ لکھے، میرے اردو کے دیوان میں سو دو سو جگہ یہ لفظ آیا ہوگا۔

مجھ کو بنگالے سے آئے ہوئے بتّیس، تینتیس برس ہو گئے، بہت احباب مر گئے، بہت متفرق ہو گئے، اب ایسا وہاں کوئی نہیں جس سے ارسال رسائل کی رسم و راہ ہو۔ صاحب! وہ شعر جس کو تم نے پوچھا ہے، یہ ہے۔

واعظ نہ تم پیو ، نہ کسی کو پلا سکو   کیا بات ہے تمھاری شراب طہور کی

دو شعر اس غزل کے اور یاد آ گئے ہیں، وہ دوسرے صفحے پر لکھتا ہوں۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب   آؤ نہ! ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں   کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی

دیکھو یہ ''پر'' کا مخفف ''پہ'' ہے بہ معنی لیکن۔

جس بحر میں کوئی اسم یا کوئی لفظ نہ آ سکے، اس کی تدبیر فردوسی و خاقانی سے بھی نہ ہوگی۔ میں کیا کروں گا؟ نام تمھارا آ سکتا ہے لیکن الف دیتا رہتا ہے خدا کے واسطے اس کی تدبیر سرور صاحب سے بھی ضرور پوچھنا۔

نجات کا طالب، غالب

سہ شنبہ ۱۲ فروری ۱۸۶۱ء

منشی ہرگوپال تفتہ کے نام

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

بندہ پرور............

تم کو پہلے یہ لکھا جاتا ہے کہ میرے دوست قدیم میر مکرم حسین صاحب کی خدمت میں میرا اسلام کہنا اور یہ کہنا کہ اب تک جیتا ہوں اور اس سے زیادہ میرا حال مجھ کو بھی معلوم نہیں۔ مرزا حاتم علی صاحب مہر کے جناب میں میرا اسلام کہنا اور یہ میرا شعر میری زبان سے پڑھ دینا۔

شرط اسلام بود ورزش ایماں بالغیب اے تو غائب ز نظر ، مہر تو ایمان من ست

تمھارے پہلے خط کا جواب بھیج چکا تھا کہ اُسکے دو دن یا تین دن کے بعد دوسرا خط پہونچا۔ سنو صاحب، جس شخص کو جس شغل کا ذوق ہو اور وہ اس میں بے تکلف عمر بسر کرے، اس کا نام عیش ہے، تمھاری توجہ مفرط بطرف شعر وسخن کے، تمھاری شرافت نفس اور حسن طبع کی دلیل ہے اور بھائی، یہ جو تمھاری سخن گستری ہے، اس کی شہرت میں میری بھی تو نام آوری ہے۔ میرا حال اس فن میں اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے اشعار سب بھول گیا۔ مگر ہاں، اپنے ہندی کلام میں سے ڈیڑھ شعر یعنی ایک مقطع اور ایک مصرعہ یاد رہ گیا ہے۔ سو گاہ گاہ جب دل الٹنے لگتا ہے، تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آجاتا ہے۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرعہ پڑھ کے چپ ہو جاتا ہوں۔

اے مرگ نا گہاں! تجھے کیا انتظار ہے؟

یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دُکھ مجھ کو ہے اس کا بیان تو معلوم، مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں سے جوان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، اُس میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق تھا اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیونکر نہ دشوار ہو، ہائے اتنے یار مرے کہ جواب میں مروں گا تو میرا کوئی رونیوالا بھی نہ ہوگا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

غالب

معنی اور اشارے:

مطالب متفسرہ	پوچھے گئے مفاہیم، تشریحات
مخفف	گھٹایا گیا، تخفیف کیا گیا، وہ لفظ جس میں سے کوئی حرف کم کیا گیا ہو
روحانی دوست	قلبی یا دلی دوست
متفرق	مختلف، جدا، منتشر ہونا، بکھر جانا
شغل	مشغلہ، پیشہ
مفرط	زیادہ، کثیر، کثرت
شفیق	دوست، رفیق
نام آوری	شہرت
مرگ	موت
ناگہانی	اچانک
زیست	زندگی
بے رونقی	بے لطفی
تباہی	بربادی

معروضی سوالات:

1۔ غالب کا سنۂ پیدائش کیا ہے؟

(i) 1797　　(ii) 1780

(iii) 1790　　(iv) 1800

2۔ جدید نثر کی بنیاد کس نے ڈالی؟

(i) غالبؔ (ii) حالیؔ

(iii) آزاد (iv) نظیرؔ

3۔ غالبؔ کہاں پیدا ہوئے تھے؟

(i) آگرہ (ii) دہلی

(iii) لکھنؤ (iv) مرادآباد

4۔ مراسلہ کو مکالمہ کس نے بنایا؟

(i) چکبست (ii) اقبال

(iii) دردؔ (iv) غالبؔ

5۔ غالبؔ کے خطوط کے اوّلین مجموعے کا نام بتایئے؟

(i) اردوئے معلّٰی (ii) عود ہندی

(iii) عودِ غالب (iv) مکاتیب غالبؔ

مختصر ترین سوالات:

1۔ غالبؔ پہلے کیا تخلص استعمال کرتے تھے؟

2۔ غالبؔ کی وفات کب اور کہاں ہوئی؟

مختصر سوالات:

1۔ جدید اردو نثر کی بنیاد کس طرح سے پڑی؟

2۔ مغل دربار کی طرف سے غالب کو کیا خطاب عطا ہوئے تھے۔

تفصیلی سوالات:

1۔ غالب کے خطوط کی نمایاں خصوصیات تفصیل سے بیان کیجیے۔

2۔ غالب کے حالات زندگی اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالئے۔

(2)

سرسید احمد خان

[پیدائش 1817ء، وفات 1898ء]

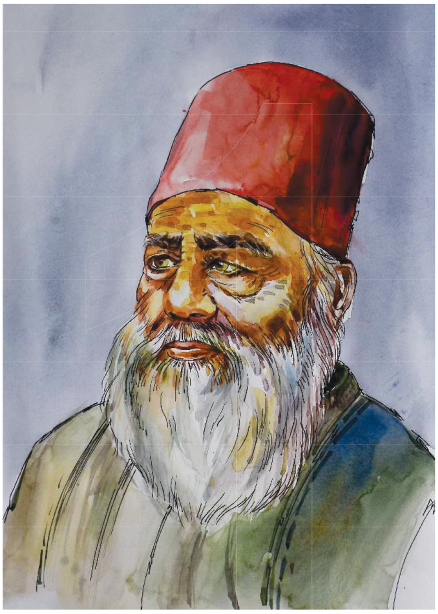

سرسید احمد خاں 1817ء میں دہلی کے ایک معزز، علم دوست اور آسودہ حال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے آبا واجداد شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان وارد ہوئے اور مغل سلطنت میں اعلیٰ عہدوں سے سرفراز ہوئے اور یہ سلسلہ عالمگیرِ ثانی کے وقت تک قائم رہا۔ آخری مغل بادشاہ سے ان کے والد کے خصوصی مراسم تھے۔ سرسید کی شخصیت اور کردار کی تشکیل وتعمیر میں ان کی والدہ کا بڑا ہاتھ ہے، جو ایک باشعار، سلیقہ منداور نیک خاتون تھیں۔

سرسید نے اپنی ملازمت کی ابتدا 1837ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں سررشتہ داری سے کی اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے صدر امین کے درجے تک پہنچ گئے۔ چنانچہ اسی ملازمت کے دوران انھوں نے اپنی مشہور کتاب ''آثار الصنادید'' لکھی جس

میں دہلی کی تاریخی عمارتوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ ملازمت کے سلسلے میں ان کا قیام مختلف شہروں میں رہا۔ جب 1857ء کی بغاوت شروع ہوئی اس وقت وہ بجنور میں مقیم تھے۔ انھوں نے یہ سارا ہنگامہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ''اسبابِ بغاوت ہند'' لکھ کر انھوں نے یہ واضح کیا کہ یہ بغاوت انگریزی سرکار کی غلط پالیسی کا نتیجہ تھی۔ بعد میں ''لائل محمڈنز آف انڈیا'' میں انھوں نے یہ وضاحت کی کہ مسلمان انگریزی سرکار سے بدخواہ اور بدظن نہیں ہیں۔ اس کے بعد انھیں صدر امین بنا کر مراد آباد بھیجا گیا جہاں انھوں نے ایک انگریزی اسکول قائم کیا۔ اس کے علاوہ ہندوستانی عوام کے لیے ایک یتیم خانہ اور شفاخانہ بھی قائم کیا۔ 1863ء میں جب ان کا تبادلہ غازی پور ہوا تو وہاں انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان مغرب کی ترقی اور خیالات سے آگاہ ہو سکیں۔ اس کے علاوہ اس سوسائٹی کے زیر اہتمام بہت سی اہم انگریزی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کرایا گیا تا کہ مسلمان نئے علوم و فنون سے واقف ہو سکیں۔

ایک انگریز ولیم میور نے ''لائف آف محمدؐ'' لکھی جس میں سیرت پاک کے خلاف زہر افشانی کی اور نازیبا کلمات استعمال کیے۔ سر سید نے جب یہ کتاب دیکھی تو مضطرب اور پریشان ہو گئے۔ اپنا تمام اثاثہ فروخت کر کے اور دوستوں سے قرض لے کر انگلستان گئے اور اس کا دنداں شکن جواب لکھا جو بعد میں ''خطبات احمدیہ'' کے نام سے اردو میں شائع ہوا۔

اپنے انگلستان کے دورانِ قیام سر سید کو مغربی تہذیب اور طرز معاشرت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس مطالعہ نے ان کے ذہن و فکر کے دریچے کو وا کر دیا اور ان کے دل میں مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کا خیال پیدا کر دیا۔ انگلستان سے واپسی کے بعد اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا، جس میں مذہبی اور اخلاقی مضامین شائع ہوتے تھے۔ منشا یہ تھا کہ مسلمانوں کے خیالات میں وسعت اور ترقی پیدا ہو۔ اس رسالہ نے مسلمانوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ اردو نثر کو اس سے خاص طور پر فائدہ پہنچا۔

سر سید کے کارناموں میں سب سے اہم کارنامہ علی گڑھ کالج کا قیام ہے۔ دراصل انگلستان جانے کا ان کا ایک اہم مقصد وہاں کے تعلیمی اداروں کا مطالعہ کرنا اور ہندوستان میں اسی طور کا ایک کالج قائم کرنا بھی تھا۔ چنانچہ ہندوستان واپس آکر اپنے خواب کے عملی تکمیل کے لیے علی گڑھ میں ایک تعلیمی ادارہ ''محمڈن اینگلو اورینٹل کالج'' کے نام سے قائم کیا۔

پنشن لینے کے بعد سرسید کالج کی ترقی کے لیے ہمہ تن مصروف ہو گئے اور ترقی کر کے یہ کالج اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے ایک اہم تعلیمی ادارہ بھی قائم کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ سارے ملک میں جگہ جگہ تعلیمی ادارے قائم کئے جائیں۔ سرسید نے آخری وقت تک جس جانکاہی اور دور اندیشی سے اس کالج کے لیے کوششیں کیں، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ 1898ء میں سرسید نے طویل عمر پا کر علی گڑھ میں انتقال کیا۔

اردو نثر کے ارتقاء میں سرسید کا گراں قدر حصہ ہے۔ انھوں نے اردو کو علمی زبان بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی تمام تصنیفات اپنے علمی و تحقیقی مواد اور منطقی اور استدلالی طرز انداز کی وجہ سے کافی اہمیت رکھتی ہیں۔

انھوں نے اردو زبان کو ایک دل نشیں، سادہ، شگفتہ اسلوب اور لب ولہجہ سے روشناس کرایا۔ اس اسلوب کی سب سے بڑی خوبی موضوع اور ہیئت میں ہم آہنگی ہے۔ سرسید کی عبارت عام طور پر تشبیہات واستعارات، تصنع، مبالغہ آرائی اور لفظی بازی گری سے پاک ہے۔ وہ مشکل سے مشکل مضمون کو نہایت آسانی کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔ ان کی تحریر میں، سچائی، بے باکی اور خلوص کے جوہر نمایاں ہیں۔ وضاحت، صراحت اور قطعیت ان کے اسلوب تحریر کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ بحیثیت مجموعی انھوں نے اردو ادب میں صحت مند فکری عناصر داخل کئے اور اسے تازہ ادبی رجحانات سے روشناس کرایا۔ ادب میں افادی نقطۂ نظر پیدا کر کے زندگی سے اس کا رشتہ استوار کیا۔

زیر نظر مضمون سرسید کے صاف وسلیس طرز بیان کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس میں ان ادبی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے جو اس رسالہ نے شروع کے چار سال میں انجام دی تھی۔

ترقی علم انشا

جہاں تک ہم سے ہوسکا ہم نے اردو زبان کے علم ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعہ سے کوشش کی۔ مضمون کے ادا کا ایک سیدھا طریقہ اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی الفاظ کی درستی، بول چال کی صفائی پر کوشش کی۔ رنگینی عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوتی ہے جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، پرہیز کیا۔ تک بندی سے جو اس زمانہ میں مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اٹھایا جہاں تک ہوسکا، سادگی عبارت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تا کہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری یہ کوشش کہاں تک کارگر ہوئی اور ہمارے ہم وطنوں نے اس کو کس قدر پسند کیا۔ مگر اتنی بات ضرور دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے خیالات میں ضرور تبدیلی آگئی ہے اور اس کی طرف لوگ متوجہ بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اخباروں کی عبارتیں نہایت عمدہ اور صاف ہوتی جاتی ہیں۔ وہ پہلا ناپسند طریقہ ادائے مضمون کا بالکل چھوٹتا جاتا ہے۔ بھاری بھاری لفظوں اور موٹے موٹے لغتوں سے اردو زبان کا خون نہیں کیا جاتا۔ صفائی اور سادگی روز بروز عبارتوں میں بڑھتی جاتی ہے۔ خیالات بھی بالکل بدلے ہوئے ہیں۔ بہت کم اخبار ہوں گے جن میں ہر ہفتہ کوئی نہ کوئی آرٹیکل عمدہ وسلیس عبارت میں کسی نہ کسی مضمون پر نہ لکھا جاتا ہو۔ صرف اس بات کی کمی ہے کہ وہ سامان ہمارے پاس موجود نہیں ہے جس سے ہماری معلومات زیادہ ہوں اور ہمارے خیالات کو وسعت ہو۔ جو مضمون ہم لکھنا چاہیں ان کے ماخذ اور ان کے حالات اور جو بحثیں کہ ان پر ہو چکی ہیں اور جو امور ان کی نسبت متحقق ہو چکے ہیں ان سے آگاہی ہو اور یہی سبب ہے کہ بعضی دفعہ ہماری قوم کے آرٹیکلوں میں غلطی ہو جاتی ہے اور جن امور کا تصفیہ ہو چکا ہے ان ہی کو پھر کہے جاتے ہیں۔ یہ نقص اسی وقت رفع ہوگا جب کہ انواع واقسام علوم وفنون کی کتابیں ہماری زبان میں موجود ہو جاویں گی اور ہماری قوم کو عموماً ان پر دسترس ہوگی۔ سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ نے اس کام کے پورا کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ قوم کو اس طرف توجہ نہیں ہے اور اسی سبب سے اس کا

کام ادھورا پڑا ہے۔

نئی اردو نے درحقیقت ہماری ملکی زبان میں جان ڈال دی ہے۔ میر درد و ظفر نے اردو اشعار میں جو کچھ سحر بیانی کی ہوئی ہو، میر امن دہلوی نے کوئی کہانی شستہ بول چال میں کہہ دی ہو، جو اس سے زیادہ فصیح و دل چسپ و با محاورہ نہ ہوگی جو ایک پوپلی بڑھیا بچوں کے سالتے وقت ان کو کہانی سناتی ہے۔ مضمون نگاری دوسری چیز ہے جو آج تک اردو زبان میں نہ تھی۔ یہ اسی زمانے میں پیدا ہوئی اور ابھی نہایت بچپن کی حالت میں ہے۔ اگر ہماری قوم اس پر متوجہ رہے گی اور ایشیائی خیالات کو نہ ملائے گی جواب حد سے زیادہ اجیرن ہو گئے ہیں تو چند روز میں ہماری ملکی تحریریں بھی میکالے واڈیسن کی سی ہو جاویں گی۔

بعض لوگوں کو شکایت ہے کہ جو لوگ اس زمانہ میں اردو لکھتے ہیں وہ انگریزی لفظ اپنی تحریروں میں ملاتے ہیں مگر ان کو غور کرنا چاہئے کہ زندہ زبان میں ہمیشہ نئے نئے لفظ ملتے اور بنتے ہیں اور جب کوئی زبان محدود ہو جاتی ہے مردہ کہلاتی ہے۔ غیر زبان کے الفاظ کو اپنا کر لینا اہل زبان کا کام ہے مگر ان کا ملا لینا آسان کام نہیں۔ اہل زبان غیر زبان کے لفظ کو ایسی عمدگی سے ملا لیتے ہیں جیسے تاج گنج کے روضہ میں سنگ مرمر پر عقیق و یاقوت و زمرد کی پچکاری ہے۔ بے شک وہ دوسرا پتھر ہے مگر ایسا وصل ہوا ہے کہ غور سے دیکھنے پر بھی اوپر سے جڑا ہوا نہیں معلوم ہوتا۔ اسی میں سے پیدا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات اہل زبان کے سواد دوسرے سے نہیں ہو سکتی اور نہ سب اہل زبان سے، بلکہ صرف اس سے جسے خدا نے ایسا ملکہ دیا ہے۔

یہ بات بھی غور کرنی چاہیے کہ اہل زبان کے لفظوں کے لینے کی کیوں ضرورت پڑتی اس کے متعدد اسباب ہوتے ہیں۔ ایک مورخ جو کسی ملک کی تاریخ لکھتا ہے اس کو ضرور ہوتا ہے کہ اس ملک کے تاریخی الفاظ یعنی جو تاریخ سے متعلق ہیں اور ملکوں کی تقسیم اور مناسب اسی ملک کی زبان میں قائم رکھے کیوں کہ اگر ان کے لیے اپنی زبان کے الفاظ اور اصطلاح بدل دے تو وہ تاریخ نہایت نکمی اور غیر مفید ہو جاوے گی۔

قرآن مجید کو پڑھو اور دیکھو اس میں کس قدر الفاظ دوسری زبانوں کے داخل ہیں۔ اگر عربی زبان کے علم ادب

اور فنون میں الفاظ جدید شامل ہونے بند ہو جاتے تو وہ زبان بھی مثل عبرانی و سنسکرت وژند کے مردہ زبان ہو جاتی۔

علوم و فنون پر کتابیں لکھنے والا بعضی دفعہ مجبور ہوتا ہے کہ جس زبان سے اس علم کو لیا ہے اسی زبان کے بعض الفاظ اور مصطلحات بدستور قائم رکھے۔ دیکھو یونانی زبان سے جو علم طب عربی میں ترجمہ ہوا کس قدر یونانی الفاظ اس میں شامل ہیں۔ اگر کسی کو یشر غش نہ ہو تو ضرور اس کو تسلیم کرے گا۔ عربی زبان سے کمسٹری انگریزی میں گئی۔ آج تک بہت سے عربی لفظ انگریزی زبان کی کمسٹری میں شامل ہیں۔

پوچھو کہ اس مقام پر میں نے کیوں لفظ کمسٹری بولا اور کیمیا کا لفظ جس سے خود انگریزوں نے لفظ کمسٹری بنایا ہے کیوں نہ بولا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم لوگوں میں کیمیا کے لفظ کے ساتھ چاندی سونا بنانے کا خیال پیدا ہوتا ہے جو ایک محض غلط خیال ہے۔ اب وہ شخص جو اپنی قوم کی ہم دردی رکھتا ہے اور ان غلط خیالات کو مٹانا چاہتا ہے کسی جگہ کمسٹری اور کسی جگہ کیمیا کا لفظ بول جاتا ہے تا کہ کمسٹری کا لفظ اس غلط خیال کو نہ آنے دے اور کیمیا کا لفظ کمسٹری اور کیمیا کے ایک ہونے کا خیال نہ پیدا کرے۔

لٹریچر یعنی علم ادب اہل زبان کے لیے نہایت وسیع جولانا کا ہے۔ اس میں وہ اپنی طبیعت کا زور دکھلاتا ہے۔ اسی کے ذریعہ سے وہ اپنے دل کی بات دوسرے کے دل میں ڈالتا ہے۔ اپنی شستہ تقریر اور مناسب الفاظ سے لوگوں کے دلوں کو جس بات پر چاہتا ہے ابھارتا ہے، ان ہی لفظوں سے کبھی ہنسا دیتا ہے اور کبھی رلا دیتا ہے۔ پرانے دقیانوسی خیالوں کو مٹاتا ہے اور نئے نئے خیالات دلوں میں ڈالتا ہے۔ کبھی واحد کے بدلے جمع اور جمع کے بدلے واحد کے صیغے بولتا ہے۔ کبھی حاضر کو غالب اور غائب کو حاضر کہہ دیتا ہے۔ کبھی ترکیب جملہ کی دوسری زبان کی ترکیب پر گھڑ دیتا ہے۔ اور اس سب میں ایک لطف اور ایک قسم کا مزہ رکھا جاتا ہے۔ اگر وہی چال وہ چلے جو اہل زبان نہیں ہے تو سینکڑوں ٹھوکریں کھاتا ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ اہل زبان جو کہے سو صحیح ہے اور غیر اہل زبان وہ چال چلے تو غلط ہے۔ نہیں، درحقیقت اس کا کہنا صحیح اور اس کا بولنا غلط ہوتا ہے اور اہل زبان ہی اس میں تمیز کر سکتا ہے۔

دوسری زبان کے لفظوں کو اپنی زبان میں بولنا کبھی عبارت کا لطف بڑھانے کے لیے ہوتا ہے کبھی اپنی زبان کو

وسعت دینا اور نئے لفظوں کو اس میں داخل کرنا مقصود ہوتا ہے۔کبھی سامعین کو مطلب کی طرف زیادہ متوجہ کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔کبھی اس مطلب کی عظمت جتانے کو کہا جاتا ہے جو عظمت اس مرادف لفظ سے جو اس زبان میں مستعمل ہے دل میں نہیں بیٹھتی۔ مثلاً بعضے اہل زبان تحریر وتقریر میں مناسب موقع پر جس کی مناسبت کو اہل زبان ہی جان سکتے ہیں، جنٹلمین کا لفظ بولتے ہیں۔اگر وہ اس کی جگہ شریف یا شریفوں کا لفظ بولیں تو اس لفظ یا مطلب کی عظمت خاک میں مل جاتی ہے۔اس لیے کہ ہماری زبان اور عام استعمال میں لفظ شریف کا ذلیل ہو گیا ہے۔اس سے بجز اس خیال کے کہ اس کی حسب ونسب میں کچھ نقصان نہیں ہے۔

شیخ ،سید، مغل، پٹھان ہے اور کوئی خیال پیدا نہیں ہوتا مگر اس لفظ کے بولنے والا ،اس خیال سے زیادہ تر وسیع اور اعلیٰ خیال دل میں بٹھانا چاہتا ہے۔وہ اس لفظ سے ایسا شخص بتانا چاہتا ہے جو رذیل آدمیوں کی بہ نسبت خاندان میں تعلیم میں، حیثیت میں، اطوار میں افضل ہو۔اس کی تعلیم وتربیت اس کا چال چلن اچھا ہو۔ نیک اور خوش اخلاق ہو۔وہ ہر بات میں جو اس سے متعلق ہو حلیم ہو، چال چلن میں حوصلہ ومزاج میں خواہش اور ارادہ میں سلیم ہو۔ایسا ہونا تعلیم سے شروع ہوتا ہے اور پڑھے لوگوں کو نیک صحبت میں بیٹھنا اس کو پورا کرتا ہے۔اگر چہ شریف کے بھی یہی معنی ہونے چاہئیں مگر چوں کہ اس کا استعمال ایک خاص بات پر ہو گیا ہے تو یہ پورا پورا خیال اس لفظ سے دل میں نہیں آتا۔پس ایک محبّ قوم اہل زبان ان خیالوں کو دل میں ڈالنے کے لیے اپنی زبان کو وسعت دیتا ہے۔اور دوسری زبان کا نیا لفظ اپنی زبان میں ملاتا ہے تا کہ نئے لفظ کے ساتھ نیا خیال دل میں پیدا ہو۔یہی حال اس قسم کے اور لفظوں کا ہے۔اگر ہم ان سب کی تفصیل لکھیں تو ہمارا یہ آرٹیکل لغت یا اصطلاحات کی ایک کتاب ہو جاوے۔اسی نمونہ سے ہمارے ہم وطن خیال کر سکیں گے کہ ہماری قوم کو اپنی زبان کی نسبت بھی کیا کیا کرنا ہے۔اور ان لغو خیالات کو چھوڑیں گے کہ وہ شخص تو انگریزیت پر مرتا ہے۔انگریزی ہی لفظ بولتا ہے۔اپنی واقف کاری انگریزی کی جتاتا ہے۔

معنی اور اشارے:

کم مج	بے ترتیب
یاری دینا	ساتھ دینا
آرٹیکل	مضمون
وسعت	پھیلاؤ
ماخذ	جہاں سے لیا گیا ہے
محقق	تحقیق کرنے والا
رفع	دور
تصفیہ	فیصلہ
دسترس	پہنچ
مورّخ	تاریخ لکھنے والا
لٹریچر	ادب
جولاں گاہ	گھومنے کی جگہ
شستہ	صاف
دقیانوسی	پرانے
سامعین	سننے والے
اطوار	طور کی جمع، عادتیں
محبِ قوم	قوم سے محبت کرنے والا

تفرقہ	فرق
بیرونی	باہری

معروضی سوالات:

1۔ سرسید احمد خاں کب پیدا ہوئے؟

(i) 1817 (ii) 1820

(iii) 1831 (iv) 1835

2۔ سرسید احمد خاں کہاں پیدا ہوئے؟

(i) آگرہ (ii) کانپور

(iii) دہلی (iv) علی گڑھ

3۔ سرسید احمد خاں نے یتیم خانہ اور شفاء خانہ کہاں قائم کیا؟

(i) دہلی (ii) آگرہ

(iii) لکھنؤ (iv) مرادآباد

4۔ ''خطبات احمدیہ'' کس کی تصنیف ہے؟

(i) اقبال (ii) نظیرؔ

(iii) سرسید احمد خاں (iv) الطاف حسین حالیؔ

5۔ ''تہذیب الاخلاق'' رسالہ کس نے نکالا؟

(i) میرامن (ii) رجب علی بیگ سرور

(iii) سرسید احمد خاں (iv) مولانا الطاف حسین حالی

6۔ سرسید احمد خاں کا انتقال کب ہوا؟

(i) 1898 (ii) 1890

(iii) 1881 (iv) 1900

مختصر ترین سوالات:

1۔ سرسید احمد خاں نے اپنی ملازمت کی شروعات کس سے کی؟

2۔ سرسید احمد خاں کی دو تصانیف کا نام لکھیے۔

مختصر سوالات:

1۔ آثار الصنادید کا موضوع کیا ہے؟

2۔ تہذیب الاخلاق رسالہ کس نے نکالا؟

تفصیلی سوالات:

1۔ سرسید احمد خاں کی نثر کی بنیادی خصوصیات بیان کیجیے۔

2۔ سرسید احمد خاں کی حالات زندگی اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

(3)

مولوی نذیر احمد

[پیدائش 1836ء، وفات 1912ء]

مولوی نذیر احمد 1936ء میں ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان علم وفضل کے لیے مشہور تھا۔ والد کا نام مولوی سعادت علی تھا اور انھیں سے انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ بعد میں مولوی نصر اللہ ڈپٹی کلکٹر بجنور سے عربی، نحو، منطق اور فلسفہ پڑھا۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے دہلی آئے اور کچھ دنوں تک مکتب میں پڑھتے رہے۔ مگر یہاں کی تعلیم سے آسودہ اور مطمئن نہ تھے۔ خوش قسمتی سے دہلی کالج میں داخلہ مل گیا اور قابلیت کی وجہ سے وظیفہ کے مستحق قرار پائے۔ یہاں ذکاء اللہ، محمد حسین آزاد، منشی کریم الدین اور پیارے لال آشوب ان کے ہم جماعت تھے۔ ان کی

صحبتوں سے طبیعت کو اور جلا ملی۔ کالج میں آٹھ برس تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد فراغت حاصل ہوئی تو ملازمت کی فکر دامن گیر ہوئی۔ ضلع گجرات (پنجاب) میں چالیس روپے ماہوار پر مدرس ہو گئے۔ دو برس تک ملازمت کی پھر اس کے بعد استعفیٰ دے کر کانپور میں مدارس کے ڈپٹی انسپکٹر مقرر ہوئے۔ وہاں بھی ان کو ملازمت راس نہ آئی اور استعفیٰ دے دیا۔

1857ء میں نذیر احمد ڈپٹی انسپکٹر مدارس الہ آباد منتخب ہوئے اور یہاں انھوں نے اپنی محنت اور لگن سے انگریزی میں اچھی خاصی استعداد پیدا کر لی تھی۔ گورنمنٹ کو اس زمانے میں تعزیرات ہند کے ترجمہ کا کام منظور تھا۔ مولوی عظمت اللہ اور مولوی کریم بخش اس کام پر پہلے سے مامور تھے۔ بعد میں نذیر احمد بھی ترجمہ کے کام میں شریک ہوئے۔ ان کا کام اتنا پسند آیا کہ لفٹننٹ گورنر سر ولیم میور نے خوش ہو کر کانپور کا تحصیل دار مقرر کر دیا جس سے ترقی کر کے 1863ء میں ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ بعد ازاں سالار جنگ اول نے آٹھ سو روپے ماہنامہ پر حیدر آباد بلا لیا۔ یہاں رہ کر انھوں نے اپنی قابلیت سے بہت کچھ ترقی کی، لیکن آخر میں سیاسی مصلحت کے بنا پر ملازمت سے سبکدوش ہو کر دہلی چلے آئے اور باقی زندگی یہیں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں بسر کر دی۔

گورنمنٹ نے ان کے علمی خدمات کے اعتراف میں بہت سے انعامات سے نوازا۔ 1897ء میں ان کو شمس العلماء کا خطاب عطا ہوا۔ 1902ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی نے ایل۔ ایل۔ ڈی کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ آخر 1912ء میں مولوی نذیر احمد کا انتقال ہوا۔

یوں تو مولوی نذیر احمد نے مختلف موضوعات پر بہت سی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں لیکن ان کی شہرت کا اصل دار و مدار ان کے ناولوں پر ہے۔ ''مرآۃ العروس'' ان کا پہلا ناول ہے جو 1869ء میں لکھا گیا۔ یہ کتاب وہ اپنی بیٹی کو اردو سکھانے کے لیے قسط وار لکھ کر دیتے رہے۔ بعد میں اسے ایک انگریز افسر کی فرمائش پر چھپوایا گیا۔ دوسرا ناول بنات النعش (1873) ہے جو دراصل پہلے ناول کا ہی حصہ ہے۔ اس میں بھی لڑکیوں کو اچھی تعلیم حاصل کرنے، سگھڑ بننے اور اچھی زندگی گزارنے کے پہلو پیش کیے گئے ہیں۔ ان کا تیسرا ناول توبۃ النصوح (1877) سب سے زیادہ مشہور اور دلچسپ ہے۔ اس میں دلی کے زوال آمادہ مسلم گھرانے کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ ان کے ناولوں میں ابن الوقت بھی بڑی اہمیت

کا حامل ہے کیوں کہ اس میں انگریز معاشرت کی سوچے سمجھے بغیر تقلید کرنے کی مذمت کی گئی ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے قانون کی کئی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا جن میں تعزیرات ہند اور قانون شہادت ان کے قوت ترجمہ کے شاہکار سمجھے جاتے ہیں۔

نذیر احمد کا اسلوب نثر اپنی خصوصیتیں رکھتا ہے۔ان کی تحریر میں بے تکلفی اور بے ساختہ پن ہے۔ وہ تشبیہات واستعارات کا بہت کم استعمال کرتے ہیں۔اپنی عربی دانی کی وجہ سے کبھی کبھی وہ عربی الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں اور ایسے محاورے بھی لکھ جاتے ہیں جو اس مقام کے لیے ناموزوں ہوتے ہیں مگر اس کے پہلو بہ پہلو ہندی کے ٹھیٹ الفاظ لانے سے دریغ نہیں کرتے۔ پھر بھی ان کا اسلوب تحریر بہت دلچسپ ہے۔مزاح میں ڈوبی ہونے کے باعث ان کی باتیں بہت جلد اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ بحثییت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے وہ صرف اردو کے پہلے ناول نگار نہیں بلکہ ان ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے نئے عہد کی بنیاد مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

نصاب میں شامل مضمون ''ایک انگریز حاکم سے ملاقات'' ان کے مشہور ناول ابن الوقت سے منتخب کیا گیا ہے۔ زیر نظر سبق میں نذیر احمد ایک انگریز حاکم سے ایک ہندوستانی ڈپٹی کلکٹر کی ملاقات کا واقعہ بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ یہاں پر مصنف یہ دکھلانا چاہتے ہیں کہ انگریزوں نے ہندوستان میں کس انداز کی دفتر شاہی قائم کی تھی۔ حالانکہ یہ دفتر شاہی بادشاہوں کے زمانے سے چلی آ رہی تھی، لیکن یہاں حاکم انگریز اور محکوم ہندوستانی تھے۔

ایک انگریز حاکم سے ملاقات

میں انگریزوں کی ملاقات کا ایسا چور ہوں کہ جب دیکھتا ہوں کہ اب بہت دن ہو گئے ہیں تو ہفتوں پہلے سے ارادہ کرتا ہوں اور آخر زبردستی ٹھیل کر دھکیل کر اپنے تئیں لے جاتا ہوں تو کوٹھی پر جا کر ہمیشہ وہی بے لطفی، وہی بے عزتی۔ جاڑا ہو، پانی برستا ہو، کڑاکے کی دھوپ ہو، لوئیں چلتی ہوں، ہندوستانی ڈپٹی نہیں ڈپٹی کا باوا کیوں نہ ہو اور چاہے وہ اپنے مکان سے چار گھوڑے کی بگھی پر سوار ہو کر کیوں نہ آیا ہو کلکٹر- جنٹ- اسسٹنٹ کی تو بڑی بارگاہیں ہیں اگر یوریشین ڈپٹی کلکٹر سے بھی ملنے گیا ہے۔ (اور نہ ملے تو رہے کہاں) تو احاطے کے باہر اُترنا ضرور اور احاطے بھی شیطان کی انتڑی کہ ہم جیسے پرانی فیشن کے لوگ کوٹھی تک پہنچتے پہنچتے ہانپنے لگتے ہیں اور اگر صاحب کہیں اس حال میں دیکھ پائیں تو سمجھو کہ ملاقات کو گئے نوکری نذر کر آئے۔ اسی دن رپورٹ ہوئی دھری ہے کہ یہ شخص دس قدم پیدل نہیں چل سکتا۔ گویا ڈپٹی کلکٹر کو ضرور ہے کہ کم سے کم ڈاک کے ہرکارے کی ایک چوکی تک پوئی نہیں تو دُلکی پیشی کا بستہ لے کر بھاگ سکے۔ پس اس ڈر کے مارے کسی درخت کی آڑ میں یا کوئی ایسا ہی گانٹھ کا پورا ہے اور اس نے شاگرد پیشوں کو پہلے سے چکھوتیاں کرادی ہیں تو باورچی خانے یا اصطبل میں پاؤ گھنٹے آدھ گھنٹے کھڑے کھڑے دم لیا اور جب سانس اچھی طرح پیٹ میں سمانے لگا تو رومال سے منھ ہاتھ پونچھا، ہاتھ سے ڈاڑھی مونچھ کو سنوار آہستہ سے عمامے کو ذرا اور جما لیا چغے کے دامن سمیٹے اور بڑے مودّب مقطع بن کر ہاتھ باندھے نیچی نظریں کیے ڈرتے ڈرتے دبے پاؤں کوٹھی کی طرف بڑھے، خدمت گار اور اردلی کے چپراسیوں نے تو احاطہ کے باہر ہی تاڑ لیا تھا کوٹھی کے پاس آتے ہی قصداً اِدھر اُدھر کو ٹل گئے۔ تھوڑی دیر زینے کے نیچے ٹھٹکے کہ کوئی آدمی نظر آئے تو اوپر چڑھنے کا قصد کریں۔ چلنے کی، باتوں کی اور چیزوں کے رکھنے کی اٹھانے کی آوازیں ہیں کہ چلی آتی ہیں مگر کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔ آخر ناچار ستون کی آڑ میں جوتیاں اتار ہمت کر کے بے بلائے اوپر پہنچے، کرسی نہیں، مونڈھا نہیں، فرش نہیں کھڑے سوچ رہے ہیں کہ کیا کریں، لوٹ چلیں، پھر خیال آتا ہے ایسا نہ ہو لوٹتے کو صاحب اندر

آئینوں میں سے دیکھ لیں۔ شرمندگی کے ٹالنے کو وہیں تھوڑی سی جگہ میں ٹہلنا شروع کیا۔ اتنے میں باورچی خانے کی طرف سے ایک آدمی آتا ہوا نظر آیا۔ جی خوش ہوا کہ اس سے صاحب کا اور اردلی کے لوگوں کا حال معلوم ہوگا۔ وہ لپک کر ایک دوسرے دروازے سے اندر گھس گیا اور ادھر کورخ بھی نہ کیا۔ غرض کوئی آدھے گھنٹے (اور اس انتظار میں تو ایسا معلوم ہوا کہ دو گھنٹے) اسی طرح کھڑے سوکھا کئے۔ بارے خدا خدا کر کے ایک چپراسی اندر سے چٹھی لیے ہوئے نمودار ہوا، کیا کریں اپنی غرض کے لیے گدھے کو باپ بنانا پڑتا ہے۔ حیا اور عزت کو بالائے طاق آپ منھ پھوڑ کر اس کو متوجہ کیا کیوں جمعدار کچھ ملاقات کا بھی ڈھنگ نظر آتا ہے؟ بس اس کو ڈپٹی کلکٹری کا ادب سمجھو یا شکایت کا ڈر مگر میں جانتا ہوں کہ ادب اور ڈر تو خاک بھی نہیں صرف اتنی بات کا لحاظ کہ شہر کی فوج داری سپرد ہے۔ خدا جانے کب موقع آپڑے چار و نا چار اچٹتا ہوا سا سلام کر کے جیسے کوئی مکھی اڑاتا ہے اس کو کہنا پڑا کہ آج ولایت کی ڈاک کا دن ہے ملاقات تو شاید ہی ہو لیکن آپ بیٹھیے۔ ابھی تو صاحب غسل خانے میں ہیں یہ کہہ کر پھر وہ اندر کو جانے لگا تو آخر رہا نہ گیا اور زبان سے نکلا کہ کہاں بیٹھوں اپنے سر پر تب اس نے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی تکیہ اور ایک بازو ندارد، گویا بید کی تپائی لا کر ڈال دی۔ اس کے بعد سے جب کوئی چپراسی یا خدمت گار باہر آتا یہی معلوم ہوتا کہ ابھی صاحب غسل خانے سے نہیں نکلے (الٰہی کیا غسل میّت ہے) اب کپڑے بدل رہے ہیں اب میم صاحب کے کمرے میں ہیں اب چٹھی لکھ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر کو معلوم ہوا کہ کھانے کی میز پر ہیں۔ یہ سن کر جی ہی تو بیٹھ گیا کہ بس اب کیا خاک ملاقات ہوگی۔ ارادہ ہوا کہ گھر کی راہ لیں، پھر خیال ہوا کہ کون وقتوں سے انتظار کر رہے ہیں۔ آنا تو پڑے گا ہی دوسرے دن کا کیا بھروسا، اتنی محنت کیوں ضائع کی جائے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اور صبر کرو۔ بڑی دیر کے بعد چپراسی یہ حکم لے کر آیا کہ سررشتہ دار کو رپورٹ خوانی کے لیے بلایا ہے۔ اب رہی سہی امید اور بھی گئی گزری ہوئی تب تو اپنا سا منھ لے کر چپراسی سے یہ کہتے ہوئے اٹھے کہ خیر میں تو اب جاتا ہوں صاحب سے میرے آنے کی اطلاع کر دینا تب خدا جانے چپراسی کے دل میں کیا آئی کہ کہنے لگا میں دوبار آپ کی اطلاع کر چکا ہوں کچھ بولے نہیں۔ اب پھر کہے دیتا ہوں۔ خفا ہوں گے تو آپ میری آدھ سیر آٹے کی فکر رکھنا غرض بلائے گئے۔ صاحب کو دیکھا تو پائپ منہ میں لئے ٹہل رہے ہیں۔ بس معلوم ہو گیا کہ مطمئن ملاقات نہیں ہوسکتی۔ سر جھکائے کوئی کاغذ یا کتاب دیکھ رہے

ہیں۔اب کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی کہ کیونکر ان کو خبر کروں کہ میں آیا ہوا کھڑا ہوں کیا معلوم ہے شاید جان بوجھ کر کھڑا رکھا ہو۔ بلکہ مجھ کو تو اس بات کا بھی شبہ ہے کہ میرے آنے کی بہت دیر پہلے سے ان کو خبر تھی۔ چپراسی نے شاید نہ بھی کہا ہو مگر چاروں طرف آئینہ کے کواڑ ہیں۔عین سامنے کے دروازے سے آیا، درختوں کے نیچے ٹہلتا رہا، بڑی دیر تک برآمدے میں بیٹھا رہا، کیا اتنے عرصے میں ایک بار بھی ان کی نظر نہ پڑی ہوگی ضرور پڑی ہوگی۔ خیر آخر آپ ہی سر اٹھایا اور ''ڈپٹی صاحب! حاکم بالا دست ہو کر جو اتنی آؤ بھگت کرے تو اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔صاحب نے بندہ نوازی میں کچھ کمی نہیں کی۔آنکھیں چار ہوتے ہی اپنے مقابل دوسری طرف کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اپنے گھر یا آپس میں ایک دوسرے کے گھر کرسیوں پر بیٹھنا کون نہیں جانتا لیکن میں تو اپنے سے زیادہ تنخواہ کے ہندوستانی صدر الصدوروں اور ڈپٹیوں کا انگریزوں کے روبرو کرسی پر بیٹھنا دیکھے ہوئے تھا۔تم خدا کے بندے ہو یقین ماننا بس ڈنڈے پر الگ تھلگ جیسے اڈّے پر گلدم۔کرسی پر بیٹھنا ہی تھا کہ کم بخت چپراسی نے پیچھے سے ہاتھ جوڑ کر کہا خداوند سررشتہ دار حاضر ہیں'' صاحب میری طرف دیکھتے'' جاتے ہیں اور چپراسی سے فرما رہے ہیں ''اچّا آنے بولو'' یعنی اچھا سررشتہ دار سے کہو چلے آئیں۔سبحان اللہ! سات برس اسسٹنٹ رہے نو برس کے قریب جنٹ اور اس سولھا برس میں صرف ایک بار ڈیڑھ برس کے لیے فرلو پر ولایت گئے تھے۔ بارہ برس دلّی میں رہے اور بھاڑ جھونکا۔ چودہ برس میں حضرت نے اردو میں کیا کمال حاصل کیا ہے! ''اچّا آنے بولو'' اب میں منتظر ہوں کہ صاحب کچھ پوچھیں تو جواب دوں اور سررشتہ دار مردود آگے آگے آپ پیچھے بستہ قلمدان لیے ہوئے چپراسی آ ہی گھسا۔سررشتہ دار کے روبرو مجھ سے پوچھتے ہیں تو کیا پوچھتے ہیں ''ول صاحب گرمی بوٗٹ'' میں۔گردن جھکا کر'' ہاں خداوند! گرمی کے تو دن ہی ہیں۔میرے علاقے میں تو پولیس کی رپورٹ سے ایسا معلوم ہوا کہ لُو سے بھی کئی آدمی مرے''۔ صاحب کو تو یہ جواب دے رہا ہوں اور دل میں کہہ رہا ہوں کہ گرمی کا تو حال معلوم تھا ارے ظالم تجھ کو یہ بھی خدا کا ترس نہ آیا کہ ایک بندۂ خدا جس کو کچہری میں سرکار سے ایک ٹٹّی ملی ہے، (ناظر اپنی بدذاتی سے تین برس کے پرانے خس کی بندھوا دیتا ہے تو وہ جانے اور اس کا ایمان) اور جس کو گھر پر بھی ٹٹّی لگانے کا مقدور ہے اور جو واقع میں گرمی بھر اپنے گھر کی ٹٹّی میں رہتا ہے کتنی دیر سے برآمدے میں پڑا ابھن رہا ہے۔لاؤ سلام لے کر اس کو آزاد کروں۔ میں سمجھا تھا کہ آدمیوں کا لُو سے مرنا سن

کر چونک پڑے گا اور ضرور پوچھے گا کہ کس تھانے سے رپورٹ آئی ؟ کتنے آدمی مرے؟ کب مرے؟ لُو کا ہندوستانی کیا علاج کرتے ہیں؟ اور کوئی لاش ڈاکٹر صاحب کے ملاحظے کو بھی آئی یا نہیں؟ غرض آدمی کا دل بولنے اور بات کرنے کو چاہے تو بہتیرے حیلے ہیں۔ پر صاحب تو کچھ پی سے گئے نہیں معلوم دھیان سے سنا یا سمجھے نہیں یا کالے آدمیوں کے مرنے کی پروا نہیں کی۔ اب سررشتہ دار ہے کہ بستہ کھول کر کاغذ پھیلا رہا ہے۔ اور میری اور صاحب کی یہ تپاک کی ملاقات ہو رہی ہے کہ دونوں چُپ۔ جب سررشتہ دار کاغذ پھیلا لگا صاحب کا منہ دیکھنے، تو صاحب مجھ سے فرماتے ہیں۔ ''آپ کُچ کُچ''، یعنی آپ کو کچھ اور کہنا ہے۔ یہ سنتے ہی میں تو یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا کہ ''نہیں میں تو صرف سلام کے لیے حاضر ہوا تھا۔ بہت دن ہو گئے تھے، جی ملنے کو چاہتا تھا، پھر حاضر ہوں گا''۔ میری اس اخیر بات میں اور باتیں ہی ایسی کون سی بہت ہوئی تھیں کہ اس کو اخیر کہوں، بلکہ دوسری بات میں ''جی ملنے کو چاہتا تھا'' بالکل جھوٹ تھا۔ کس مسخرے کا جی ملنے کو چاہتا تھا اور کس مسخرے کا جی اب ملنے کو چاہتا ہے۔ ملاقات کے بامزہ اور بے مزہ ہونے کا معیار وقت ہے۔ دیر تک ملاقات رہی تو جانو کہ خوب دل کھول کر باتیں ہوئیں، ہماری ملاقات کیا خاک بامزہ سمجھی جائے کہ جانا اور اٹھاؤ چولھے کی طرح بیٹھنا اور گفتگو اور رخصت سب کچھ دو ہی منٹ میں ہو ہوا چکا۔ اپنے حساب سے کون ایسا تیسا ملاقات کے ارادے سے گیا تھا۔ خدا گواہ ہے صرف ماتھا پھٹوّل، وہ بھی اپنے سر کا چھدا اتارنے کے لیے۔ صاحب مجھ سے چاہتے ایک بات بھی نہ کرتے مگر سررشتہ دار اور چپراسیوں کو میرا الٹے پاؤں آنا معلوم نہ ہوتا تو مجھ کو کچھ بھی شکایت نہ تھی، مگر میری تفضیح ان لوگوں کی نظروں میں ہوئی جو منصبی عزت میں میرے پاسنگ بھی نہ تھے باہر نکلا تو چپراسیوں اور خدمت گاروں کا غول کا غول برآمدے میں موجود تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی سب نے فرشی سلام کیا۔ الٰہی یہ کاہے کی ایسی لمبی چوڑی تعظیم ہو رہی ہے، گھنٹوں میں برآمدے میں بیٹھا سوکھا کیا ان میں سے کسی کی صورت بھی نظر نہ پڑی۔ اب یہ حشرات الارض کہاں سے نکل پڑے۔ آہا! میں اتنی جانفشانی کے بعد صاحب کو ایک سلام کر لینے کا گنہگار ہوں۔ یہ سرکاری پیادے اس کا جرمانہ وصول کرنے کے لیے مجھ پر تعینات ہیں۔ ہر چند کہتا ہوں مکان پر تنخواہ پر دیکھا جائے گا۔ عید قریب ہے اس میں سمجھ لینا۔ بے حیا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ آخر میں نے ذرا ترش رو ہو کر کہا کہ اس وقت میرے پاس نہیں ہے، ہوتا تو دینے کا نام دنیا، کبھی کا دے چکا ہوتا۔ ایسی ہی بے اعتباری ہے تو

ایک آدمی میرے ساتھ چلو۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ایک آدمی تیار سا ہوا کہ مجھ سے پہلے آگے کوچ بکس پر بیٹھ لے، اتنے میں جمعدار نے پنسل اور ایک پرچہ کاغذ نکال کر میرے ہاتھ دیا کہ حضور ناظر کو رقعہ لکھ دیں۔ جب جب میں قلم اٹھاتا تھا بے ادب ہاتھ پکڑ پکڑ لیتے تھے ''پہلے فرما دیجیے کہ آپ کیا لکھتے ہیں'' اسی کشمکش میں بڑھتے بڑھتے میں تو اپنی بگھی تک جا پہنچا، سائیس پٹ کھولے کھڑا ہی تھا، لپک کر پائدان پر پاؤں رکھ کر غڑپ بگھی کے اندر سائیس نے کھٹ سے پٹ بھیڑ دیا اور گھوڑا تھا کہ آہٹ پاتے ہی چل نکلا۔ میں نے کوچبان سے لے کر کاغذ کے پرزے میں ایک روپیہ رکھ پڑیا بنا اردلیوں کو دکھا کر نیچے پھینک دیا۔ پھر میں نے کھڑکی سے منہ نکال کر دیکھا تو ایک چپراسی نے پڑیا اٹھائی بھی، ایک روپیہ دیکھ کر یقیناً بہت بگڑے ہوں گے۔ مگر میں ان کی گالیوں کی زد سے باہر نکل جا چکا تھا۔ بگھی کے اندر بیٹھ کر میں نے ایک ایسا لمبا سانس لیا جیسے کوئی مزدور سر پر سے بھاری بوجھ اتار کر، تمام راستہ اسی ملاقات کی ادھیڑ بن میں طے ہوا۔ بار بار خیال آتا تھا کہ سر رشتہ دار اور چپراسیوں کی نظر میں میری کیا عزت رہی۔ اب یہ لوگ تمام شہر میں اس کا ڈھنڈورا پیٹیں گے۔ ایسی بے حرمتی سے روٹی کمانے پر لعنت ہے۔ پھر دل کو سمجھاتا کہ عزت ایک امر اضافی ہے مجھے اپنے اقران و امثال پر نظر کرنی چاہیے۔ ان کے ساتھ بھی تو انیس (۱۹) بیس (۲۰) کے فرق سے ایسی مدارات کی جاتی ہے تو جس مجلس میں یہ سب ننگے ہیں وہاں لنگوٹی کی کیا شرم۔ اسی حیص بیص میں گھر پہنچا۔ چند آدمی منتظر ملاقات بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر نہ وہ ڈپٹی تھے اور نہ میں کلکٹر کہ برآمدے میں محتاج اطلاع بیٹھے ہوں۔ آئے تو میں موجود نہ تھا۔ مزے میں گاؤ تکیوں کے سہارے سے پھیل پھیل کر بیٹھے گھر میں سے پان آ گئے۔ آدمیوں نے حقے بھر دیے جوں مجھ کو دیکھا ایک صاحب بولے ''اللہ اکبر ڈپٹی صاحب! آج تو کلکٹر صاحب سے خوب گاڑھی چھنی، کون وقتوں سے میں آپ کا منتظر بیٹھا ہوں'' دوسرے صاحب'' آج بندے کا ارادہ بھی کلکٹر صاحب کے سلام کو جانے کا تھا۔ معلوم ہوا کہ ڈپٹی صاحب تشریف لے گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ بس آج کسی کی دال نہیں گلتی''، تیسرے صاحب: ''مدت سے جدید تحصیلداری قائم ہونے کی خبر تھی یہاں تک کہ بورڈ سے منظوری بھی آ چکی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج اسی انتظام کے صلاح مشورے میں دیر لگی''۔ لوگ آپس میں یہ باتیں کر رہے ہیں اور میں کپڑے اتارتا جاتا ہوں اور اندر ہی اندر دل میں خوش ہوں کہ بھلا ہے خدا کرے لوگ ایسی ہی غلط فہمی میں مبتلا رہیں۔

معنی اور اشارے:

چُور	بدمست، متوالا، سرشار
کلکٹر	حاکم ضلع
اسسٹنٹ	مددگار، معاون
ہرکارہ	ہر کام کرنے والا، قاصد، چپراسی
پوئیاں	تیز، سرپٹ، گھوڑے کی ڈلکی چال
اصطبل	گھوڑے، خچر وغیرہ کے باندھنے کا مکان، طویلہ
عمامہ	پگڑی
چغا	عبا، لباس
مودب	ادب کے ساتھ
مُقطع	تراش خراش کے، آراستہ کیا ہوا، مہذب
اردلی	پیادہ ساتھ رہنے والا سپاہی، ہرکارہ
قصداً	جان بوجھ کر
ستون	کھمبا
مونڈھا	ایک بیٹھنے کی چیز جسے سرکنڈوں یا بانس کی پتلیوں سے بنا کر اوپر سے بُن دیتے ہیں
نمودار	ظاہر
چاروناچار	خوامخواہ
سررشتہ دار	میر منشی، ہیڈ کلرک

بندہ نوازی	بندہ پروری، مہربانی، عنایت
صدرالصدور	اعلیٰ درجے کا منصف، شاہی گھر کا محافظ
روبرو	آمنے سامنے
خداوند	آقا، حاکم، عہدیدار
فرلو	وطن جانے کی رخصت، غیر موجودگی کی چھٹی
خداترس	خدا سے ڈرنے والا، رحم دل
حیلہ	بہانہ
تپاک	گرم جوشی، آؤ بھگت، اخلاص، محبت
متھا پھٹول	سر پھوڑنا
چھدا	الزام، بہتان
تفضیح	بے عزتی، فضیحت
منصبِ عزت	عزت کا مرتبہ
غول کا غول	جھنڈ کا جھنڈ
فرشی سلام	وہ سلام جو بہت جھک کر کیا جائے، تعظیمی سلام
حشرات الارض	کیڑے مکوڑے
جاں فشاں	محنت، کوشش
ترش رو	ناخوش، چڑ کر
سائیس	گھوڑے کی خدمت اور دیکھ بھال کرنے والا
غڑپ	جلدی

اُدھیڑ بُن	غور وفکر، سوچ وچار
امرِ اضافی	غیر اصلی بات
اقران	قرین کی جمع، ہم عصر لوگ، معاصرین
امثال	مثل کی جمع، ہم صورت، ہم شکل
مدارات	خاطر، تواضع، آؤ بھگت
حیص بیض	شور وغوغا

معروضی سوالات:

1۔ نذیر احمد کہاں پیدا ہوئے؟

(i) دلی (ii) بجنور

(iii) رام پور (iv) مرادآباد

2۔ نذیر احمد کس کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔

(i) دلی کالج (ii) فورٹ ولیم کالج

(iii) اورینٹل کالج (iv) کلکتہ کالج

3۔ اردو کا پہلا ناول کون سا ہے؟

(i) ابن الوقت (ii) فسانۂ آزاد

(iii) مرآۃ العروس (iv) امراؤ جان ادا

4۔ قانون شہادت اور تعزیرات ہند کس کے شاہکار ترجمے ہیں؟

(i) محمد حسین آزاد (ii) نذیر احمد

(iii) حالؔی (iv) سر سید احمد خاں

5۔ نذیر احمد کا انتقال کب ہوا؟

(i) 1910 (ii) 1915

(iii) 1905 (iv)1912

مختصر ترین سوالات:

1۔ دلی کالج میں نذیر احمد کے کون کون سے لوگ ہم جماعت تھے۔

2۔ نذیر احمد کے کسی تین ناولوں کے نام لکھیے ۔

3۔ نذیر احمد کے دو شاہکار ترجموں کے نام بتائیے۔

مختصر سوالات:

1۔ نذیر احمد کے ناولوں کا بنیادی موضوع کیا ہے؟

2۔ ابن الوقت میں نذیر احمد کس چیز کو موضوع بنایا ہے؟

3۔ اس سبق میں ایک انگریز حاکم سے ایک ہندوستانی ڈپٹی کلکٹر کی ملاقات کے واقعہ کو اپنے الفاظ میں مختصراً بیان کیجیے۔

تفصیلی سوالات:

1۔ نذیر احمد کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

2۔ نذیر احمد کے اسلوب تحریر پر روشنی ڈالیے۔

3۔ نذیر احمد کے حالاتِ زندگی مختصراً بیان کیجیے۔

4۔ اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

(4)

عبدالحلیم شرر

[پیدائش 1860ء، وفات 1926ء]

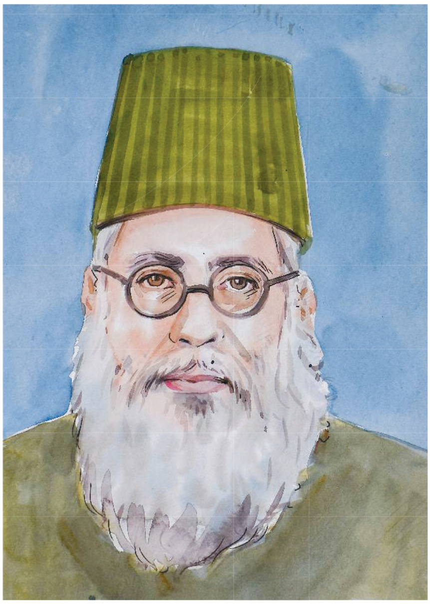

عبدالحلیم شرر کا شمار ابتدائی ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ انگریزی ادب کے ذریعہ اردو میں جب یہ صنف متعارف ہوئی تو نذیر احمد اور سرشار نے اسے اپنے انداز میں برتا جسے بعد میں عبدالحلیم شرر نے تقویت بخشی۔ چونکہ اردو ادب میں یہ نو وارد صنف تھی اس لیے اولین ناول نگاروں کے یہاں فن ناول نگاری کا فقدان نظر آتا ہے پھر بھی اردو زبان و ادب میں اس صنف کو شناخت بخشنے کا سہرا انھیں ادیبوں کے سر بندھتا ہے۔ عبدالحلیم شرر کی پیدائش لکھنؤ میں 1860ء میں ہوئی۔ تعلیم کا آغاز لکھنؤ میں ہی ہوا لیکن ان کے والد حکیم تفضّل حسین جو کہ واجد علی شاہ کے ملازم تھے، انھیں مٹیا برج کلکتہ بلا لیا، وہاں کے

علمی ماحول سے شرر نے استفادہ کیا اور عربی و فارسی کے ساتھ ہی انگریزی کا علم بھی حاصل کیا۔

عبدالحلیم شرر کی ادبی خدمات کا بڑا حصہ اسلامی تاریخ اور اس کے احیا سے متعلق ہے۔ شرر نے 1887ء میں اپنا رسالہ 'دلگداز' جاری کیا اور اس میں اپنے کئی ناول مثلاً ملک العزیز ورجینا حسن انجلینا' منصور موہنا وغیرہ قسط وار شائع کیے۔ انھوں نے حیدرآباد میں بھی قیام کیا اور ادبی خدمات انجام دیں لیکن وہاں حالات موافق نہ ہونے کی سبب لکھنؤ واپس آ گئے۔

عبدالحلیم شرر کے ناولوں میں اسلامی تاریخ بنیادی عنصر ہے۔ اسلامی شان و شوکت کا احیا ان کی تصانیف کا اصل مقصد ہے۔ ان کی زندگی میں بھی اور بعد میں بھی ان کے ناول بے حد مقبول ہوئے حالانکہ ان کے بیشتر ناول فن ناول نگاری پر کھرے نہیں اترتے۔ فردوسِ بریں، فلورا فلونڈا، زوال بغداد ان کے اہم ناول ہیں۔ 1926ء میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

یہ اقتباس مولانا شرر کی مشہور تصنیف ''مشرقی تمدن کا آخری نمونہ'' سے منتخب کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے خاص طور پر قابل قدر کہ اودھ کے تاریخی و جغرافیائی حالات کو ادب کی چاشنی دے کر پیش کیا گیا ہے۔

لکھنؤ میں فنونِ ادبیہ کی ترقی

اردو زبان کو جو ترقیاں لکھنؤ میں حاصل ہوئیں وہ شاعروں، ادیبوں، نثاروں اور مصنفوں ہی تک محدود نہیں ہیں۔ مختلف سوسائٹیوں اور طبقوں میں ترقی وہ وسعت زبان کی نئی نئی صورتیں پیدا ہوئیں جنھوں نے ہر گروہ والوں کے لیے خاص دل چسپیاں پیدا کیں۔

ان میں سے زیادہ قابل توجہ داستان گوئی ہے۔ جو دراصل فی البدیہہ تصنیف کرنے کا نام ہے۔ یہ فن اصل میں عربوں کا ہے جہاں عہد جاہلیت میں بھی داستان گوئی کی صحبتیں مرتب ہوا کرتی تھیں لیکن ہندوستان کی داستان گوئی کی نسبت ہم نہیں جانتے کہ عرب کی قصہ خوانی سے اس کا کوئی رشتہ ہے یا نہیں۔ امیر حمزہ کی داستان جو داستان گویوں کی اصلی اور حقیقی جولان گاہ ہے وہ دراصل فارسی میں تھی اور کہتے ہیں کہ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں امیر خسرو نام ایک قابل شخص نے اسے تصنیف کیا۔ تاریخ سے ثابت ہوا کہ ملوک تغلق کے عہد میں داستان امیر حمزہ موجود تھی۔ دہلی کے مشہور داستان گو لکھنؤ میں آنا شروع ہوئے، یہاں افیونیوں نے ان کی یہاں تک قدر کی کہ داستان سننے کو اپنی صحبتوں کا ایک عنصر اعظم قرار دے لیا۔ چند ہی روز میں لکھنؤ کے اندر اس کو اس قدر فروغ ہو گیا کہ کوئی دولت مند نہ تھا، جس کی سرکار میں کوئی داستان گو نہ مقرر ہو۔ سیکڑوں داستان گو پیدا ہو گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے آج کل کے مقبول سے مقبول اسپیکروں میں سے ابھی تک کسی کو فصیح البیانی میں وہ درجہ نہیں نصیب ہو سکا ہے جو قادر الکلام داستان گویوں کو حاصل تھا۔ دہلی میں بھی دو ایک صاحب کمال داستان گو آج تک پڑے ہیں۔ مگر لکھنؤ میں ان کا شمار بہت زیادہ ہے، اور ان کے طرز تقریر کا اثر عوام شہر کی زبانوں پر بے حد پڑ گیا ہے۔ ناولوں کا ذوق پیدا ہونے کے بعد جب اس بات کی کوشش کی گئی کہ داستان کو داستان گویوں ہی کی زبان میں قلم بند کرا لیا جائے تو لکھنؤ ہی ایسے با کمال داستان گو پیش کر سکا جنھوں نے ضخیم جلدیں لکھ کر اردو داں پبلک میں

پھیلا دیں۔ چنانچہ جاہ اور قمر کے تصانیف ملک میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔

داستان کے چار فن قرار پا گئے ہیں۔ رزم، بزم حسن وعشق اور عیاری۔ ان چاروں فنون میں لکھنؤ کے داستان گویوں نے ایسے ایسے کمال دکھلائے ہیں جن کا اندازہ بغیر دیکھے اور سنے نہیں ہوسکتا، الفاظ میں تصویر کھینچنا اور تصویروں کا نہایت گہرا دیرپا اثر سامعین کے دلوں پر ڈال دینا اور لوگوں کا خاص کمال ہے۔

سوشل تفنن، مذاق، ظرافت اور دل لگی کے عنوان سے بھی لکھنؤ میں علم زبان کے کئی فن پیدا ہو گئے جن میں کوئی مقام لکھنؤ کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ انھیں میں سے ایک فن پھبتی کہنا ہے۔ اس کو دراصل شاعرانہ تشبیہ واستعارے سے تعلق ہے۔ لیکن اس میں اتنی خصوصیت ہے کہ کسی کو بگاڑ کے دکھانے، اس کے عیب کے نمایاں کرنے اور برجستہ گوئی انوکھی ہنسانے والی اور عیب ونقصان ظاہر کرنے والی تشبیہ پیش کردینے تک محدود ہے۔ لکھنؤ کے ادنیٰ ادنیٰ لڑکے، بازاری عورتیں، جاہل دکاندار، ادنی طبقوں کے اہل حرفہ تک ایسی برجستہ پھبتیاں کہہ جاتے ہیں کہ باہر والوں کو حیرت ہو جاتی ہے۔ ایک صاحب کربلا کے معلّٰی کی زیارت کر کے واپس آئے اور برّاق کپڑے پہن کے دوستوں میں آ کے بیٹھے ہی تھے کہ ایک لونڈے نے کہا ''این یہ فرات کا بگلا کہاں سے آ گیا؟''۔ ایک بوڑھے دولھا خضاب کر کے دولھن بیاہنے کو آئے اور بڑی دھوم کی برات لائے زنانے سے نکل کر وہ محفل میں آرہے تھے۔ جوتا اتارنے کے لیے جھکے اور چند قدم گھٹنے ٹیک کر فرش پر چلے۔ کسی کی زبان سے نکلا۔ ''دولھا کہاں ہیں؟'' شوخ مزاج رنڈی جو کھڑی مجرا کررہی تھی ہنس کے بولی ''اے وہ مینوں چلا تو آتا ہے۔'' ایک کبڑیا چوک میں پونڈے بیچ رہا تھا۔ صدا یہ تھی کہ ''ارے بھائی یہ کنکوے کون لوٹے گا؟'' کیا اس سے زیادہ با مذاق کوئی استعارہ ہوسکتا ہے؟ نازک ترین استعارہ وہ ہے جس میں مشبہ اور مشبہ بہ دونوں کا نام نہ لیا جائے صرف مشبہ بہ کی کوئی خصوصیت بتا کے کلام میں لطف پیدا کر دیا جائے۔ اس کی اس سے بہتر مثال کون ہوسکتی ہے کہ نہ پونڈے کا نام لیا نہ لگے کا، جس سے کون کوے لوٹے جاتے ہیں۔ صرف اتنا کہہ کے کہ ''کن کوے کون لوٹے گا؟'' یہ بتا دیا کہ یہ پونڈے لگوں کے برابر ہیں جن سے کن کوے لوٹے جاتے ہیں، اور پھر اس سے زیادہ مناسب اور بازری لوگوں کے مذاق کی کوئی تشبیہ نہیں ہوسکتی۔ اس طرح کی صدہا ہزارہا مثالیں ہیں جو یہاں کی صحبتوں میں اٹھتے بیٹھتے ہر وقت سنی جاتی ہیں۔

دوسرا ''ضلع'' ہے۔ یہ دراصل شاعرانہ رعایت ہے جس نے عوام کی بات چیت اور مذاق کی گفتگو میں آ کے خاص رنگ پیدا کرلیا ہے۔ ضلع میں کوشش کی جاتی ہے کہ جس چیز کا تذکرہ آ جائے اس کے تمام متعلقات کو کسی نہ کسی پہلو سے باتوں میں لے آئے جائیں آزاد فقیر جو ایک خاص وضع رکھتے تھے۔ ضلع بولنے میں باکمال مانے جاتے تھے۔ امانت نے اپنی شاعری میں رعایت کی اس قدر کوشش کی کہ تمام شاعرانہ خوبیوں سے قطع نظر کر کے رعایت ہی کو اپنا مقصد قرار دے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا کلام شاعری کے درجے سے نکل کے ضلع بولنے کے حکم میں داخل ہوگیا۔ مگر لکھنؤ کے اکثر عوام نے اپنی بے تکلفی کی صحبتوں میں اس فن کو اس قدر بڑھا دیا ہے کہ امانت کی شاعری پیچھے پڑ گئی۔ سچ یہ ہے کہ کسی جگہ کے لوگ ضلع بولنے میں اہل لکھنؤ کے عشر عشیر درجے کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اس فن میں ایک کتاب بھی شائع ہوگئی۔

تیسرا ''فن تک بندی'' ہے۔ یہ شاعری کی قافیہ پیمائی ہے بہت سے جاہل جب ادھر توجہ کرتے ہیں تو جواب سوال میں اس طرح فی البدیہہ قافیہ استعمال کرتے ہیں کہ بڑے بڑے شعرا کو حیرت ہو جاتی ہے۔ ہم نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں ایک ہندو ''بڑھیا کے کاتے'' والا دیکھا تھا جو صبح کو خوانچہ لگا کے نکلتا۔ صورت دیکھتے ہی صدہا بازاری لونڈے اسے گھیر لیتے اور وہ سرِ راہ خوانچہ رکھ کے بیٹھ جاتا۔ فوراً لونڈوں سے اس کا تک بندی میں مقابلہ شروع ہو جاتا، سارا مجمع ایک طرف ہوتا۔ فریقین میں گالیوں کی بوچھار ہوتی، مگر شرط تھی کہ کوئی گالی تک سے باہر نہ ہو، اور کوئی قافیہ رہ نہ جائے۔ ہم نے اسے بیسیوں بار دیکھا۔ گھنٹوں اس سے مقابلہ رہتا۔ مگر ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ وہ جواب میں کبھی عاجز رہا ہو، کوئی نہ کوئی قافیہ ڈھونڈھ کے پیش ہی کر دیتا تھا۔

اسی طرح مذاق اور گفتگو میں طرح طرح کی خیال آفرینیاں ہوتی تھیں اور جاہل عوام بعض وقت ایسے خیالات پیش کر دیا کرتے تھے کہ بڑے بڑے شعرا حیرت میں رہ جاتے۔ یہ زمانہ دراصل لکھنؤ کا گولڈن ایج تھا۔ شاعری اور ادبی خوبیاں لوگوں کے رگ و پے میں سرایت کرگئی تھیں۔ ہر شخص جو معمولی طور پر پڑھنے میں شد بد ہو جاتا طبع آزمائی شروع کر دیتا۔ جہلا و عوام، ادنیٰ طبقے کے لوگوں اور گھر بیٹھنے والی عورتوں تک میں شاعرانہ لوچ اور ادبی نزاکتیں پیدا ہوگئیں تھیں۔ ان پڑھ کبڑیے شاعر تھے۔ اور جہلا کی زبان بھی اس قدر شستہ و رفتہ اخلاقی حفظ مراتب کے الفاظ سے مملو اور تمدنی آداب

سے لبریز تھی کہ اکثر صاحب علم ان کی گفتگو سن کے ششدر رہ جاتے اور کسی کو ان پر جاہل ہونے کا گمان بھی نہ ہوتا۔ سودا بیچنے والوں کی صدائیں شاعرانہ نکات اور فصاحت و بلاغت کے غوامض سے اس قدر آراستہ و پیراستہ تھیں کہ اوروں کو سمجھنا بھی دشوار تھا۔

ادنیٰ طبقے والوں نے بھی اپنے مذاق کے مطابق خاص ادبی دل چسپیاں پیدا کر لی تھیں۔ مثلاً ایک فن خیال کا پیدا ہو گیا۔ لوگ فی البدیہہ اشعار تصنیف کر کے دائرے پر گاتے۔ اس کا نام خیال اس لیے رکھا گیا کہ ہر شخص اپنے تخیل کا جوہر دکھائے اور کوئی نئی بات پیدا کرے۔ اس فن میں یہاں بہت سے باکمال پیدا ہوئے جن کو اعلیٰ سوسائٹی اور تعلیم یافتہ لوگوں کی صحبتوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مگر بجائے خود اگر غور کیجیے تو وہ اصلی اور فطری شاعری تھی اور اسی وضع کی شاعری جیسی کہ عہد جاہلیت عرب میں تھی۔

اسی طرح ایک گروہ ڈنڈے والوں کا پیدا ہو گیا۔ ان لوگوں کی یہ شان تھی کہ قریب کے زمانے کے اہم اور مشہور واقعات کو کمال آزادی کے ساتھ موزوں کرتے جو جیسا ہوتا چاہے وہ کتنا ہی صاحب اثر اور دولت مند ہوا ہے، اسے ویسا ہی بڑی بے باکی سے دکھاتے اور ثابت کرتے کہ ملک و قوم کو اس سے کیا فائدہ ہوا یا کتنا بڑا ضرر پہنچا۔ پھر اپنی ان نظموں کو ایک شعر خوانی کی خاص وضع میں ڈنڈے بجا بجا کے سناتے۔

عورتوں کی زبان مردوں کے مقابل ہر ملک اور ہر قوم میں زیادہ شستہ اور دل کش ہوتی ہے، مگر لکھنؤ میں یہ خاص بات تھی کہ محلات اور محترم خاندان کی معزز بیگموں کی زبان میں علاوہ نسائی دل فریبیوں کے ادبی اور شاعرانہ نزاکتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ باتیں کرتیں تو معلوم ہوتا کہ منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں اور غور کیجیے تو صحت الفاظ، پیاری بندشیں اور طرز ادا کی نزاکتیں بتاتیں کہ زبان کی خوبیاں اس سرزمین میں کس اعلیٰ کمال کو پہنچ گئی ہیں۔

معنی اوراشارے:

صدا	آواز
ششدر	حیران، پریشان
پھبتی کہنا	ظریفانہ تشبیہ
آراستہ	سجا ہوا
نثّار	نثر لکھنے والے
قادرالکلام	جسے کلام پر قدرت ہو
ضلع	پسلی، لکیر، خط
عشرعشیر	سویں حصے کا دسواں حصہ، بہت تھوڑا سا
عنصر اعظم	بڑا حصہ
عاجز	لاچار، کمزور
معزّز	عزت دار
محلات	محل کی جمع
حفظ مراتب	مرتبے کا لحاظ

معروضی سوالات:

1۔ عبدالحلیم شرر کہاں پیدا ہوئے؟

(i) لکھنؤ (ii) الہ آباد

(iii) مٹیا برج کلکتہ (iv) حیدر آباد

2۔ شرر کے والد کہاں ملازم تھے؟

(i) مٹیا برج (ii) لکھنؤ

(iii) دہلی (iv) پٹنہ

3۔ شرر کے اس سبق میں کس فن کا ذکر ہے؟

(i) سپہ گری (ii) سنگ تراشی

(iii) مصوری (iv) علمِ زبان

4۔ شرر نے کون سا رسالہ جاری کیا؟

(i) دلگداز (ii) کلیم

(iii) اردوئے معلّٰی (iv) اردو اخبار

5۔ تاریخی ناول کس ناول نگار نے لکھے ہیں؟

(i) عبدالحلیم شرر (ii) پریم چند

(iii) راشدالخیری (iv) رتن ناتھ سرشار

مختصر ترین سوالات:

1۔ 'لکھنؤ میں فنونِ ادبیہ کی ترقی' شرر کی کس تصنیف سے ماخوذ ہے۔

2۔ داستان گوئی کا آغاز کہاں ہوا؟

3۔ داستانِ امیر حمزہ کا تعلق کس زبان سے ہے۔

مختصر سوالات:

1۔ داستان کے کتنے فن ہیں؟

2۔ لکھنؤ میں عورتوں کی زبان (گفتگو) کیسی تھی؟

3۔ امانت کی شعری خصوصیت کیا تھی؟

تفصیلی سوالات:

1۔ لکھنؤ کے کن فنون کو شرر نے شامل کیا ہے؟ اپنے الفاظ میں واضح کریں۔

2۔ شرر کی حالاتِ زندگی پر نوٹ لکھیں۔

(5)

پنڈت رتن ناتھ سرشار

[پیدائش 1847ء، وفات 1902ء]

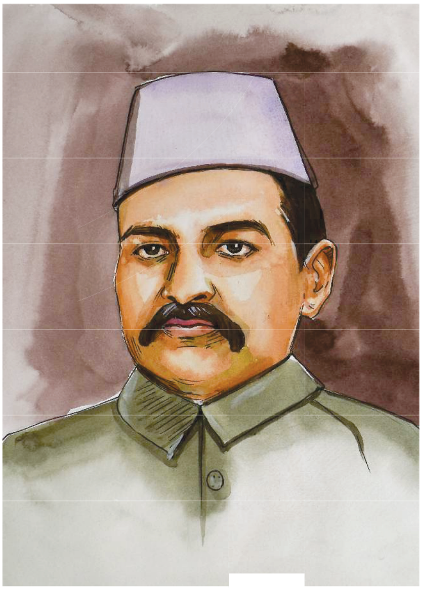

پنڈت رتن ناتھ سرشار اصلاً کشمیری برہمن تھے لیکن ان کا گھر لکھنؤ میں آباد تھا۔ 1847ء میں سرشار یہیں پیدا ہوئے اور لکھنؤ کے ہی کیننگ کالج (Canning College) سے تعلیم حاصل کی۔ سرشار کا ذہن اسکولی نصاب کے بجائے سماجی مشاہدہ کی جانب زیادہ مائل تھا۔ چنانچہ ان کا تعلیمی سلسلہ تو جلد ہی ٹوٹ گیا لیکن لکھنؤ کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی، اس کے اندر کی خلا اور کشمکش، سماج کے اوپری سطح کی صنّاعی اور چمک سب کچھ ان کی تخلیقات میں موجود ہے۔ لکھنؤ کی ٹوٹتی اور بکھرتی تہذیب اور سماجی زوال کو دیکھنا ہو تو ان کی تصنیف فسانۂ آزاد کو دیکھیے جو ان کا شاہکار ہے جسے گیان چند

جین نے داستان اور ناول کی درمیانی کڑی قرار دیا ہے۔لکھنؤ کے بانکے، افیونی، پتنگ باز، طوائفین ، اٹھائی گیرے، بٹیر باز، میل ٹھیلے، تہذیبی مجالس، رئیس، مصاحب گویا لکھنوی تہذیب کے سارے نقش ونگار سے فسانۂ آزاد آراستہ ہے۔

سرشار نے مضمون نگاری کی ابتدا اودھ پنچ سے کی۔اس کے بعد جب منشی نول کشور نے اودھ اخبار جاری کیا تو وہ اس کے مدیر مقرر ہوئے اوراسی اخبار میں لکھنؤ کی تہذیب ومعاشرت کے حوالے سے ان کے مضامین شائع ہوئے جنھیں بعد میں ترتیب دے کر فسانۂ آزاد کے عنوان سے 1880ء میں شائع کیا۔یہی وجہ ہے کہ ان کی یہ تخلیق ناوِل کے پیمانہ پر پوری طرح کھری نہیں اترتی۔لیکن اردو میں ناول نگاری کے آغاز کے حوالے سے اس کی بہت اہمیت ہے۔سرشار کا اسلوب مزاحیہ اور زبان محاورات سے دلکش ہوگئی ہے۔

ان کی اہم تصانیف میں جامِ سرشار، سیر کہسار، خدائی فوجدار، پی کہاں وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔وہ 1895ء میں حیدرآباد چلے گئے اور وہاں دبدبۂ آصفی کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔1902ء میں حیدرآباد میں اس دارِفانی سے کوچ کیا۔

مصاحبوں کی نوک جھونک

میاں آزاد کمان کے تیر کی طرح چل کھڑے ہوئے اور سیدھے ریل کے اسٹیشن پر پہنچے۔ لگے پلیٹ فارم پر چہل قدمی کرنے۔ اتنے میں دیکھتے کیا ہیں کہ اغل بغل مشعل دستی روشن، اِدھر اُدھر مصاحبین، رفقا خوشامد خورے، لیمو نچوڑ، بیچ میں ایک امیر کبیر رئیس ابن رئیس، بڑے ٹھسّے سے آرہے ہیں۔ ''ہٹو، بچو، دور باش، وادب'' کی آواز بلند ہے سب کے پہلے اس جھنڈ کی نظر میاں آزاد پر پڑی جو ہے انھیں کو گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔ یہ اس وقت وحشت میں جو آئے تو اور بھی ڈبل چال چلنے لگے۔ رئیس کے مصاحبین سب حاضر جواب، تیز طبیعت، زباں دراز، فقرہ باز، ٹھٹھول، ضلع جگت میں طاق، پھبتی کہنے میں مشّاق، آوازہ کسنے میں شہرۂ آفاق تھے پھبتی نہ کہیں تو ذہن کند ہو جائے۔

ایک نے کہا ''حضور دیکھیے گا یہ فرنگی بھی واللہ عقل کے پتلے ہیں۔ آسمان میں انھوں نے تھگلی لگائی ذری دیکھیے تو بے پٹری کے چھوٹا موٹا انجن چبوترے پر چلا دیا۔''

دوسرا بولا: ''خدا کی قسم کیا لاگ ہے۔''

تیسرے صاحب نے فرمایا: ''خداوند یہ چلتا پرزہ ہے۔''

چوتھے: ''ماشاء اللہ! ذری اس وحشت کو ملاحظہ فرمائیے گا! یہ احتباس! یہ گرمی! اور آپ سیاہ بانات کا دگلا ڈانٹے گھوم رہے ہیں۔''

پانچواں: بادۂ انانیت کے نشے میں جھوم رہے ہیں۔

چھٹا: ''یہ سر ہے یا دھیلے والا کدو، یہ توند ہے یا بابا گڑ مئو کا تربوز۔''

ساتواں: ''ماشاء اللہ کیا چہرۂ نورانی ہے۔''

میاں آزاد نے دیکھا کہ پھبتیوں کا گراب ہی پڑنے لگا۔ جسے دیکھو نئی سناتا ہے، جو ہے وہ بناتا ہے تو پر پرزے

چھاڑ کر یہ بھی جواب ترکی بہ ترکی دینے پر آمادہ ہوگئے۔ جیسے ہی ایک مصاحب نے کہا کہ ماشاء اللہ کیا چہرۂ نورانی ہے۔ میاں آزاد تڑ سے بول اٹھے واللہ اچھا غولِ بیابانی ہے۔

مصاحب: اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی

رفیق: اس کالی بانات کے دگلے پر مجھے دھوکا ہوا کہ کسم کے کھیت سے بنڈیلا نکل آیا

لیمونچوڑ: ع سب صورت لنگور ذرا دم کی کسر ہے۔

میاں آزاد نے اس کا مصرع اولیٰ پڑھ دیا۔

ع لاحول ولاقوۃ یہ کون بشر ہے۔

ایک اور صاحب نے آگے بڑھ کر پوچھا: اسم نامبارک؟

میاں آزاد نے کہا: آپ کا مزاجِ پلید؟

دوسرے نے قہقہے لگا کر کہا کس کھیت کے ہو؟

یہ بولے ''بھیرئے کے بھاٹے سے کب نکلنے بھئی؟''

رئیس کو میاں آزاد کی باتیں ایسی بھائیں کہ پاس بلوالیا۔

''حضرت آپ اس وقت چومکھ لڑ رہے تھے۔ یہ آپ ہی کا کام ہے۔''

میاں آزاد جھک کر ایک فراشی سلام بجالائے۔

رئیس با توقیر امیر کبیر تھے ہی۔ جس سے خوش ہوئے دم کے دم میں نہال کر دیا۔ فرمایا کہ آج سے آپ ہمارے ساتھ رہا کیجئے۔

خانۂ احسان آباد بہت خوب، ہمراہ رکاب ہوں۔ جہاں حضور کا پسینہ گرے میں خون گراؤں میں۔ کوئی تیکھی چتون سے دیکھے تو آنکھیں پھوڑ ڈالوں۔''

مصاحبوں کو میاں آزاد کا نوکر ہونا کانٹے کی طرح کھٹکا۔

ایک: (دبے دانتوں) پیرومرشد! استخارہ تو دیکھ لیں واجب آئے تو کیا مضائقہ۔

دوسرے: (جل بھن کر) ''خداوند! بے سمجھے بوجھے کیوں کر یہ رکھ لئے گئے۔ خدا جانے چور ہیں اُچکّے، خونی ہیں، یہ ہیں کون بلا اور یوں صورت سے تو مرد آدمی سب ہی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر کسی کے دل کا حال کیا معلوم۔''

تیسرے: بیشک کیا چوٹٹوں کے سر پر دو سینگ ہوتے ہیں۔

چوتھے: ''حضور والا۔ یہ ایک دفعہ جعلی دستاویز بنانے کی علّت میں ماخوذ ہو چکے ہیں۔''

پانچویں: اجی یہ تو برف بیچا کرتے ہیں، مگر واللہ اچھا نقشہ جمایا۔

چھٹے: خداوندان کے چشم ازرق پر نظر ڈالیں، یہ عین دلیل طوطے چشمی کی ہے۔

ساتواں: ناصاحب ان کا یہاں کہاں ٹھکانا۔

میاں آزاد سب کی ہانک سن کر بولے''۔ پیرومرشد، یہ سب چوٹٹے اٹھائی گیرے ہیں۔ جانبازوں میں بندہ درگاہ ہی ہیں اچھا ایک کام نہ کیجئے، اسٹیشن پر کوئی کام بتا دیجئے دیکھئے کون حسنِ لیاقت سے انجام دیتا ہے۔''

مصاحب: تو آپ تو ریل کے خلاصیوں میں کام کر چکے ہیں، آپ سے اس میں کون بھڑے۔

آزاد: ''اچھا حضور، عروض میں کچھ سوال و جواب ہوں، دیکھیے ان سب کا قافیہ تنگ کر دیتا ہوں یا نہیں۔''

اتنے میں ایک مصاحب نے جھلاّ کر کہا: ''ابے واہی ہوا ہے، ٹیں ٹیں لگائی ہے۔ کہیں میں ایک گدّا نہ دوں۔ حضور کو بھولا بھالا سادہ مزاج دیکھ کر بہت چل نکلا ہے، چل الگ ہٹ!''

میاں آزاد: یہ گیڈر بھبکیاں! اے کیوں نہ ہو شانِ خدا، آپ اور ہمیں گدّا دیں۔ سن او گاؤدی، ہم گدّا کھانے والے نہیں، کیا کہوں ایک رئیس کے مصاحبوں میں نہ ہوتا تو اسی دم گردن ناپتا۔ مگر کل تم کو ٹھیک بناؤں گا۔

اس میں ایک رفیق نے ڈپٹ کر کہا۔ ''آپ ہیں کس بھکوئے رئیس کے مصاحب۔''

میاں آزاد نے کہا: دیکھئے خداوند نعمت ایسے مصاحب ہیں حضور کے، ایک تو حضور کے سامنے گدّا دینے پر آمادہ ہیں، دوسرے پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئے۔ تیسرے آپ کے دشمنوں کو بھکوا بنایا۔ چوتھے صاحب نے فرمایا کہ ہمارے آقا

بھولے سادے آدمی ہیں۔اب کون نہیں جانتا کہ بھولا اور سادہ اس زمانے میں گاؤدی، احمق، گھامڑ سے مراد ہے لاحول ولاقوۃ!۔

رئیس کو یہ کلمے ایسے برے معلوم ہوئے فوراً مصاحبوں کو للکارا۔جس نے بھکوا کہا تھا وہ تو کھڑے کھڑے موقوف ہوا۔کیوں بے نمک حرام! یہ کیا بات چیت تھی۔جس کا نمک کھائے اسی کو بھکوا بنائے۔ابھی موقوف ان کو نکال دو۔

میاں آزاد نے ''بہت خوب پیرومرشد'' کہہ کر ان کو تو اسٹیشن کے باہر نکالا۔اب ان کی شامت آئی جو سادہ مزاج بتاتے تھے۔

''کیوں بے مروک! ہم احمق ہیں؟ بھولے ہیں؟ گدھے ہیں؟ ابھی دور ہو سامنے سے۔اگر ڈھوری پر آیا تو ......رئیس نے ''تو'' کہا ہی تھا کہ میاں آزاد نے فقرہ پور کردیا......''وہ بے بھاؤ کے پڑیں گے بچہ سر پر ایک بال نہ رہے گا۔''

رئیس نے پوچھا۔کوئی ہے؟

''حاضر پیرومرشد''! کہہ کر آزاد نے ان کی بھی گردن ناپی اور اسٹیشن سے بدر کیا۔خبردار جو ڈھوری پر آیا۔تو تو جانے گا۔اب ان حضرت کی باری آئی جو گدادیتے تھے۔ہاں جی کیا تم نے کہا تھا؟ ذرا پھر تو کہنا۔گدادوگے؟ میری طرف دیکھو! گدادوگے؟

اللہ اللہ اب آپ اتنے ہوگئے کہ جس کو ہم نوکر رکھیں اس کو آپ گدادیں! ہٹ سامنے سے''

میاں آزاد نے دیکھا کہ سب کے سب کا موقوف ہونا اچھا نہیں تو کس مزے سے کہتے ہیں۔

اے خداوندان سے مجھ سے مذاق ہوتا ہے، جانے دیجیے۔

دیکھو جی! تم کو رئیسوں کی ابھی صحبت نہیں رہی ہے۔کوئی اپنے آقائے نام دار کے سامنے ایسا کلمہ منہ سے نکالتا ہے؟ لے اب خطا معاف اور کدورت صاف کراؤ، ہاتھ جوڑو، قدموں پر ٹوپی رکھو'

بے چارے نے ناچار ہاتھ جوڑے اور کانپتے ہوئے کہا: ''خداوند قصور ہوا، از خرداں خطا از برزگاں عطا۔''

اب سنئے کہ میاں آزاد نے کہا۔ چلئے حضور ہوٹل گھر دکھا دوں۔

رئیس گردوں مدار مع مشعل دستی و رفقا چلے تو آزاد نے کہا۔

''حضور اگر میرا کہنا مانیں تو اس غٹ کے غٹ کو ساتھ نہ لے چلیں۔ ان لوگوں کو حکم دیجئے کہ باہر جہاں لکڑ والا بیٹھا ہے وہاں ٹھہریں اور دستی گل کر دی جائے۔ حضور تشریف لے چلیں، کم ترین ہم راہ رکاب ہو اور ایک خادم با ادب۔''

بس ادھر رئیس مع میاں آزاد مصاحب خاص اور ایک خادم بادب کے ہوٹل کی طرف چلے ادھر مصاحبین میں ہنڈیاں پکنے لگیں۔

واہ بھئی واللہ ہم سمجھتے تھے کہ ہم ہی زمانے بھر کے فقرہ باز ہیں مگر یہ ہمارے بھی چچا نکلا۔ آدمی کیا ہے؟ بلا سے بے درماں ہے۔ یہ وہ کالی ناگن ہے جس کے کاٹے کا منتر نہیں۔ اجی سونگھ جائے تو انسان ٹیں کر کے رہ جائے۔ ارے یار ہم جانتے تو اس بدبخت پر آوازے ہی کیوں کستے کیا کہیں، شدنی، شدنی۔ دیکھو واللہ چٹکیوں میں رنگ جمایا۔ آتے ہی کھڑے کھڑے دو کو نکلوا دیا اور تیسرے کی خطا معاف کرائی۔ ایسے دخیل ہو گئے اور سنئے کس فقرے سے ہم سب کو اُس وقت ٹہلایا اور لکڑ والے سے مصاحبت گرمانے کا حکم دلوایا۔

''ہات تیری دُم میں موٹا سا رسا باندھوں! مصاحب خاص بنے ہیں چڑا''

''یارو بے ڈھب ہوئی، اب اس مردود کا نکلنا مشکل ہے۔ اس پر فقرہ چلنا سخت دشوار ہے۔ پرلے درجے کا مکّار، طرار، عیّار ہے، واللہ ہنسی آتی ہے۔''

جی، تو آپ کو ہنسی آتی ہوگی، ہماری روح تو رو رہی ہے۔''

بھلا ہنسی کا یہ کون موقع ہے، جس طرح دودھ سے مکھی نکالی جاتی ہے اس طرح ہم آپ برسوں کے رفیق نکال دئے گئے۔ کٹ جانے کا مقام ہے۔ لیجئے اس ملعون نے خدا اسے غارت کرے، آتے ہی دستی گل، دو مصاحب غائب، خود مصاحب خاص الخاص بن بیٹھے۔ اب کوئی ایسی فکر کرنا چاہئے کہ اب یہ جمنے نہ پائیں۔ ہم بتائیں۔ مشہور کر دو کہ یہ بوچڑ ہیں، نیچ قوم۔ ہمارے حضور کو اس کا بڑا خیال ہے۔ بھئی جو ابھی موقوف نہ کر دیں تو ہاتھ کٹا تا ہوں۔ ناک ناک بدتا ہوں۔

واللہ بوچڑ کی خوب سوجھی۔ مگر کہے کون۔ کسی ایرے غیرے پنچ کلیان کو لگا دو۔

ادھر رئیسِ خورشید کلاہ کو آزادِ شیخوحیت پناہ نے ہوٹل دکھایا لیمونڈ کا ایک جام پلایا اور خراماں خراماں اسٹیشن کے باہر سیر کرانے لائے۔ مصاحبوں نے دیکھا کہ مصاحب خاص سے میٹھی میٹھی باتیں کرتے آتے ہیں۔ ایک شخص کو پہلے ہی سے سکھا پڑھا رکھا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر آوازہ کسا کہ ''واہ رے زمانے کے الٹ پھیر، شریف بیچارے تو نکالے جائیں اور قوم کے بوچڑ رئیسوں کی مصاحبت پائیں۔''

اتنا سننا تھا کہ رئیس کے کان کھڑے ہوئے۔ ان کو نیچ قوم خصوصاً بوچڑوں سے بہت نفرت تھی۔ فوراً آزاد سے پوچھ بیٹھے کہ کیا آپ بوچڑ ہیں؟

اتنے میں ایک مصاحب چلا اٹھے۔ ''کہ حضور! نہیں تو اور ہیں کون۔''

دوسرے نے موقع پا کر کہا: ''ابھی کل تک تو کلیجی بیچتے تھے، آج حضور کے مصاحب خاص ہوئے۔ کیا مزے سے گر مارہے ہیں۔ گوشت بیچتے بیچتے عمر گزر گئی، اب باتیں بناتے ہو اور رئیس زادوں کو بہکاتے ہو۔''

اب میاں آزاد حیران ہیں کہ یہ سر دست اچھی بٹی، خوب پچھاڑا، کیا دل گردہ ہے، کہ کلہ بکلہ بوچڑ بنا رہے ہیں الغرض میاں آزاد کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ مصاحبین کا داؤں چل گیا۔ میاں آزاد بیچارے بوچڑ بنا کر نکال لے گئے۔

معنی اوراشارے:

مصاحب	ساتھ رہنے والا، ہم نشیں، خاص دوست
خوشامد خورے	خوشامد کرنے والا
وحشت	خوف، ڈر
مشاق	ماہر
ہم راہ	ساتھ چلنے والا
گراب	کارتوس کے چھروں سے بڑی گولی
احتباس	روک، بند ہونا
مشعل	چراغ دان، بہت موٹی بتی

معروضی سوالات:

1۔ فسانۂ آزاد میں کس شہر کی تہذیب کی عکاسی کی گئی ہے؟

(i) دہلی (ii) رام پور

(iii) لکھنؤ (iv) فیض آباد

2۔ سرشار نے کس اخبار سے مضمون نگاری کی ابتدا کی؟

(i) اودھ اخبار (ii) اودھ پنچ

(iii) تہذیب الاخلاق (iv) مخزن

3۔ 'فسانۂ آزاد' کو داستان اور ناول کی درمیانی کڑی کس نے قرار دیا؟

(i) گیان چند جین (ii) گوپی چند نارنگ

(iii) شمس الرحمٰن فاروقی (iv) احتشام حسین

4۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کس سنہ میں پیدا ہوئے؟

(i) 1847ء (ii) 1845ء

(iii) 1850ء (iv) 1856ء

5۔ 'دبدبۂ آصفی' رسالہ کس نے جاری کیا؟

(i) عبدالحلیم شررؔ (ii) رتن ناتھ سرشار

(iii) راشدالخیری (iv) دیانارائن نگم

مختصر ترین سوالات:

1۔ فسانۂ آزاد کس اخبار میں سلسلہ وار شائع ہوا؟

2۔ مصاحب کسے کہتے ہیں؟

3۔ رسالہ دبدبۂ آصفی کہاں سے شائع ہوا؟

مختصر سوالات:

1۔ 'فسانۂ آزاد' کا موضوع کیا ہے؟ اختصار کے ساتھ بتائیے۔

2۔ 'آزاد' کا کردار کس کی نمائندگی کرتا ہے؟

3۔ مصاحبوں نے آزاد کو کیسے باہر کر دیا؟

تفصیلی سوالات:

1۔ 'مصاحبوں کی نوک جھونک' سبق کا خلاصہ لکھیے۔

2۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

(6)

پریم چند

[پیدائش 1880ء، وفات 1936ء]

اردو ادب میں مختصر افسانے کا آغاز جن ادیبوں کے ہاتھوں ہوا، ان میں پریم چند کا نام سب سے نمایاں ہے۔ ان کا اصل نام دھنپت رائے تھا۔ پہلے نواب رائے کے قلمی نام سے لکھتے تھے، پھر بعد میں پریم چند رکھا۔ آج دنیائے ادب انھیں اسی نام سے جانتی ہے۔ ان کے والد کا نام منشی عجائب لال تھا۔ 1880ء میں بنارس کے قریب ایک گاؤں لمہی پانڈے پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی زندگی بڑی عسرت اور تنگ دستی میں گزری، طرح طرح کی مشکلیں جھیل کر حصول علم کے ذوق کی تسکین کرتے رہے۔ آٹھ برس فارسی پڑھنے کے بعد انگریزی تعلیم حاصل کی۔ دسویں جماعت کا امتحان بمشکل پاس کیا، مگر آگے تعلیم حاصل کرنے میں بڑی دقتیں پیش آئیں۔ مالی حالت ایسی نہ تھی کہ آگے کی تعلیم حاصل کر سکتے تھے اور نہ تو علم ریاضی میں اتنی صلاحیت تھی کہ کسی کالج میں آسانی سے داخلہ مل پاتا، کسی نہ کسی طرح پریم چند نے یہ مشکل راہ طے کی اور بعد میں بی۔اے بھی پرائیویٹ طور پر پاس کرلیا۔

پریم چند نے اپنی ملازمت کی شروعات بیس برس کی عمر میں ایک اسکول میں مدرسی سے کی۔ مدرسی کی ٹریننگ لینے کے بعد ایک اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہو گئے اور ترقی کر کے مدارس کے ڈپٹی انسپکٹر کے عہدے تک پہنچے۔ مہاتما گاندھی کے نظریات سے وہ بے حد متاثر تھے۔ جب عدمِ تعاون کی تحریک زوروں پر تھی اور جلیاں والا باغ کا تاریخی سانحہ ہوا تو پریم چند کی قومی حمیت جوش میں آئی اور انھوں نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ پھر ایک کے بعد ایک کئی اخبار نکالے مگر کوئی بھی اخبار کامیاب نہ ہو سکا۔

اردو کے اولین افسانہ نگاروں میں پریم چند کا نام سب سے اہم ہے۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ناول سے کیا، بعد میں افسانہ لکھے، ان کا پہلا افسانہ ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' ہے جو 1908ء میں رسالہ 'زمانہ' کانپور میں شائع ہوا۔ اسی سال ان کا ایک افسانوی مجموعہ ''سوز وطن'' کے نام سے شائع ہوا جسے انگریزی حکومت نے ضبط کر لیا۔ ان کے شروع کے افسانوں میں قدیم داستانی رنگ غالب ہے، لیکن بعد میں انھوں نے سماجی مسائل کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ وطن کی محبت، سماجی انصاف اور سیاسی آزادی کی خواہش کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ گاندھی واد اور ترقی پسند تحریک نے انھیں اپنی طرف متوجہ کیا، وہ اس راز سے بخوبی واقف تھے کہ ہندوستان کی آبادی کا ایک کثیر حصہ دیہات پر مشتمل ہے۔ دیہی زندگی سے انھیں گہری واقفیت حاصل تھی اور انسانی فطرت سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ چنانچہ ان کی کہانیوں کا ایک معتد بہ حصہ دیہاتی زندگی کی عکاسی پر مشتمل ہے۔ وہاں کے لوگوں کی سیدھی سادی زندگی، سیرت، سچائی اور ایمان داری کی بڑی کامیاب تصویر کشی کی ہے۔ ان کی تخلیقات کا اصل محور انسان دوستی ہے۔ وہ اصلاً ایک اصلاح پسند افسانہ نگار ہیں اور ہندوستانی سماج کی برائیوں کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ دیہات کی جہالت، توہم پرستی، غریبوں پر ظلم، سرمایہ داری اور مذہب کے ٹھیکداروں کی زیادتیوں پر انھوں نے بھرپور وار کیا۔ ان کے افسانوی مجموعے پریم پچیسی، خاک پروانہ، آخری تحفہ، زادراہ اور واردات کے نام سے شائع ہوئے جنھیں قبول عام حاصل ہوا، ان کے شاہکار افسانوں میں سوتیلی ماں، گلی ڈنڈا، سوا سیر گیہوں، نمک کا داروغہ، زیور کا ڈبہ، خون سفید، ستیہ گرہ، بڑے گھر کی بیٹی، نوک جھونک، پوس کی رات، کفن اور نجات خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔

پریم چند کے افسانوں کی ایک بڑی خوبی ان کی سادہ و سلیس اور شفاف و بے تکلف زبان ہے۔ سادگی اس کا خاص جوہر ہے۔ یوں تو فارسی و ہندی کے الفاظ عام طور پر استعمال کرتے ہیں، مگر اپنا مطلب پورا کرنے کے لیے ایسے ہی ہندی کے الفاظ استعمال کر جاتے ہیں جو عام طور پر اردو میں رائج نہیں، لیکن اس خوبی کے ساتھ کہ وہ نامانوس معلوم نہیں ہوتے۔ ان کا اسلوب تحریر بناوٹ اور تصنع سے پاک ہے۔ انھوں نے اردو کے افسانوی ادب کو ایک جاندار اور شگفتہ اسلوب عطا کیا۔

بہرکیف پریم چند کے افسانوی کی ہر دل عزیزی کا دائرہ صرف اردو زبان تک ہی محدود نہیں بلکہ ہندی والے بھی انھیں اتنی ہی عزّت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جتنی کہ اردو والے۔

پریم چند کا انتقال 1936ء میں ہوا۔

زیرِنظر افسانہ ''روشنی'' ان کے افسانوی مجموعہ واردات سے لیا گیا ہے۔اس کہانی میں پریم چند نے ایک غریب دیہاتی عورت کی خودداری، حمیت، غیرت اور عزت نفس کو بڑی فنی چابکدستی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔

روشنی

(1)

آئی۔سی۔ایس پاس کر کے ہندوستان آیا تو مجھے ممالک متحدہ کے ایک کوہستانی علاقے میں ایک سب ڈویژن کا چارج ملا۔ مجھے شکار کا بہت شوق تھا اور کوہستانی علاقے میں شکار کی کیا کمی۔ میری دلی مراد بر آئی۔ ایک پہاڑ کے دامن میں میرا بنگلہ تھا۔ بنگلے ہی پر کچہری کر لیا کرتا تھا۔ اگر کوئی شکایت تھی تو یہ کہ سوسائٹی نہ تھی اس لیے سیر وشکار اور اخبارات ورسائل سے اس کمی کو پورا کیا کرتا تھا۔ امریکہ اور یورپ کے کئی اخبار اور رسالے آتے تھے۔ ان کے مضامین کی شگفتگی اور جدت اور خیال آرائی کے مقابلے میں ہندوستانی اخبار اور رسالے بھلا کیا جچتے! سوچتا تھا وہ دن کب آئے گا کہ ہمارے یہاں بھی ایسے ہی شان دار رسالے نکلیں گے۔

بہار کا موسم تھا۔ پھاگن کا مہینہ۔ میں دورے پر نکلا اور لندھوار کے تھانے کا معائنہ کر کے گجن پور کے تھانے کو چلا۔ کوئی اٹھارہ میل کی مسافت تھی، مگر منظر نہایت سہانا۔ دھوپ میں کسی قدر تیزی تھی مگر ناخوش گوار نہیں۔ ہوا میں بھینی بھینی خوشبو تھی۔ آم کے درختوں میں بور آ گئے تھے اور کوئل کوکنے لگی تھی۔ کندھے پر بندوق رکھ لی تھی کہ کوئی شکار مل جائے تو لیتا چلوں۔ کچھ اپنی حفاظت کا بھی خیال تھا۔ کیوں کہ اُن دنوں جا بجا ڈاکے کے پڑ رہے تھے۔ میں نے گھوڑے کی گردن سہلائی اور کہا۔ چلو بیٹا، چلو ڈھائی گھنٹے کی دوڑ ہے۔ شام ہوتے ہوتے گجن پور پہنچ جائیں گے ساتھ کے ملازم پہلے ہی روانہ کر دئے گئے تھے۔

جا بجا کاشت کار کھیتوں میں کام کرتے نظر آتے تھے۔ ربیع کی فصل تیار ہو چلی تھی۔ اوکھ اور خربوزے کے لیے زمین تیار کی جا رہی تھی۔ ذرا ذرا سے مزرعے تھے۔ وہی باوا آدم کے زمانے کے بوسیدہ ہل، وہی افسوس ناک جہالت، وہی شرم ناک نیم برہنگی، اس قوم کا خدا ہی حافظ ہے۔ گورنمنٹ لاکھوں روپے زراعتی اصلاحوں پر صرف کرتی ہے۔ نئی نئی تحقیقاتیں اور ایجادیں ہوتی ہیں۔ ڈائرکٹر، انسپکٹر سب موجود اور حالت میں کوئی اصلاح، کوئی تغیر نہیں۔ تعلیم کا طوفان بے

تمیزی برپا ہے۔ یہاں مدرسوں میں کتّے لوٹتے ہیں۔ جب مدرسے میں پہنچ جاتا ہوں تو مدرس کو کھاٹ پر نیم غنودگی کی حالت میں لیٹے پاتا ہوں۔ بڑی دوادوش سے دس بیس لڑکے جوڑے جاتے ہیں جس قوم پر جمود نے اس حد تک غلبہ کرلیا ہو،اس کا مستقبل انتہا درجہ مایوس کن ہے۔اچھے اچھے تعلیم یافتہ آدمیوں کو سلف کی یاد میں آنسو بہاتے دیکھتا ہوں مانا کہ ایشیا کے جزائر میں آرین مبلغوں نے مذہب کی روح پھونکی تھی، یہ بھی مان لیا کہ کسی زمانے میں آسٹریلیا بھی آرین تہذیب کا ممنون تھا،لیکن اس سلف پروری سے کیا حاصل! آج تو مغرب دنیا کا مشعلِ ہدایت ہے۔ننھا سا انگلینڈ نصف کرۂ زمین پر حاوی ہے۔اپنی صنعت وحرفت کی بدولت بے شک مغرب نے دنیا کو ایک نیا پیغام عمل عطا کیا ہے اور جس قوم میں اس پیغام پرعمل کرنے کی قوت نہیں ہے اس کا مستقبل تاریک ہے۔ جہاں آج بھی نیم برہنہ گوشہ نشیں فقیروں کی عظمت کے راگ الاپے جاتے ہیں، آج بھی شجر وحجر کی عبادت ہوتی ہے، جہاں آج بھی زندگی کے ہر ایک شعبے میں مذہب گھسا ہوا ہے،اس کی اگر یہ حالت ہے تو تعجب کا کوئی مقام نہیں۔

میں انھیں تصورات میں ڈوبا ہوا چلا جارہا تھا، دفعتاً ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا جسم میں لگا تو میں نے سر اوپر اٹھایا مشرق کی جانب منظر گرد آلود ہو رہا تھا،افق گرد وغبار کے پردے میں چھپ گیا تھا،آندھی کی علامت تھی، میں نے گھوڑے کو تیز کیا،لیکن لحہ بہ لحہ غبار کا پردہ وسیع اور بسیط ہوتا جارہا تھا اور میرا راستہ بھی مشرق ہی کی جانب تھا۔گویا میں یکّہ وتنہا طوفان کا مقابلہ کرنے دوڑا جارہا تھا۔ ہوا تیز ہوگئی، وہ پردۂ غبار سر پر آ پہنچا اور دفعتاً میں گرد کے سمندر میں ڈوب گیا ہوا اتنی تند تھی کہ کئی بار میں گھوڑے سے گرتے گرتے بچا۔ وہ سراسراہٹ اور گڑگڑاہٹ تھی کہ الاماں گویا فطرت نے آندھی میں طوفان کی روح ڈال دی ہے۔ دس بیس ہزار توپیں ایک ساتھ چھوٹتیں تب بھی اتنی ہولناک صدا نہ پیدا ہوتی۔ مارے گرد کے کچھ نہ سوجھتا تھا، یہاں تک کی راستہ بھی نظر نہ آتا تھا۔اُف ایک قیامت تھی جس کی یاد سے آج بھی کلیجہ کانپ جاتا ہے۔ میں گھوڑے کی گردن سے چمٹ گیا اور اس کے ایالوں میں منہ چھپالیا۔سنگ ریزے گرد کے ساتھ اڑ کر منھ پر اس طرح لگتے تھے جیسے کوئی کنکریوں کا پچکاری میں بھر کر مار رہا ہو۔ایک عجیب دہشت مجھ پر مسلط ہوگئی۔کسی درخت کے اکھڑنے کی آواز کانوں میں آجاتی تو پیٹ میں میری آتیں تک سمٹ جاتیں! کہیں کوئی درخت پہاڑ سے میرے اوپر گرے تو یہیں رہ جاؤں

طوفان میں ہی بڑے بڑے تو دے بھی تو ٹوٹ جاتے ہیں۔ کوئی ایسا تو دہ لڑھکتا ہوا آ جائے تو بس خاتمہ ہے۔ ملنے کی بھی تو گنجائش نہیں۔ پہاڑی راستہ کچھ سوجھائی دیتا نہیں۔ ایک قدم داہنے بائیں ہو جاؤں تو ایک ہزار فٹ گہرے کھڈ میں پہنچ جاؤں۔ عجیب ہیجان میں مبتلا تھا۔ کہیں شام تک طوفان جاری رہا تو موت ہی ہے۔ رات کو کوئی درندہ آ کر صفایا کر دے گا۔ دل پر بے اختیار رقت کا غلبہ ہوا۔ موت بھی آئی تو اس حالت میں کہ لاش کا بھی پتہ نہ چلے، افوہ! کتنی زور سے بجلی چمکی ہے کہ معلوم ہوا ایک نیزہ سینے کے اندر گھس گیا۔

دفعتاً جھن جھن کی آواز سن کر میں چونک پڑا۔ اس اراہٹ میں بھی جھن جھن کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی جیسے کوئی سانڈنی دوڑی آ رہی ہو۔ سانڈنی پر کوئی سوار تو ہوگا ہی مگر اسے راستہ کیوں کر سوجھ رہا ہے۔ کہیں سانڈنی ایک قدم بھی ادھر ادھر ہو جائے تو بچہ تحت الثریٰ میں پہنچ جائیں۔ کوئی زمین دار ہوگا مجھے دیکھ کر شاید پہچانے بھی نہیں، چہرے پر منوں گرد پڑی ہوئی ہے مگر ہے بلا کا ہمّت والا۔

ایک لمحے میں جھن جھن کی آواز قریب آ گئی۔ پھر میں نے دیکھا کہ ایک جوان عورت سر پر ایک کھانچی رکھے قدم بڑھاتی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ ایک گز کے فاصلے سے بھی اس کا صرف دھندلا سا عکس نظر آیا۔ وہ عورت ہو کر اکیلی مردانہ وار چلی جا رہی ہے۔ نہ آندھی کا خوف ہے نہ ٹوٹنے والے درختوں کا اندیشہ، نہ چٹانوں کے گرنے کا غم، گویا یہ بھی کوئی روزمرہ کا معمولی واقعہ ہے۔ مجھے دل میں غیرت کا احساس کبھی اتنا شدید نہ ہوا تھا۔

میں نے جیب سے رومال نکال کر منھ پونچھا اور اس سے بولا ''او عورت! جگن پور یہاں سے کتنی دور ہے؟''

میں نے پوچھا تو بلند لہجے میں، مگر آواز دس گز نہ پہنچی عورت نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں۔

میں نے چیخ کر پکارا ''او عورت! ذرا ٹھہر جا، جگن پور یہاں سے کتنی دور ہے؟''

عورت رک گئی۔ اس نے میرے قریب آ کر، مجھے دیکھ کر، ذرا سر جھکا کر کہا، کہاں جاؤ گے؟

''جگن پور کتنی دور ہے؟''

''چلے آؤ، آگے ہمارا گانو ہے، اس کے بعد گجن پور ہے''

تمھارا گانو کتنی دور ہے؟

''وہ کیا آگے دکھائی دیتا ہے''

''تم اس آندھی میں کہیں رک کیوں نہیں گئیں؟''

''چھوٹے چھوٹے بچے گھر پر ہیں، کیسے رک جاتی۔ مرد تو بھگوان کے گھر چلا گیا'' آندھی کا ایسا زبردست ریلا آیا کہ میں شاید دو تین قدم آگے کھسک گیا۔ گرد و غبار کی ایک دھونکنی سی منہ پر لگی۔ اس عورت کا کیا حشر ہوا، مجھے خبر نہیں۔ میں پھر وہیں کھڑا رہ گیا۔ فلسفے نے کہا، اس عورت کے لیے زندگی میں کیا راحت ہے۔ کوئی ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا ہوگا، دو تین فاقہ کش بچے، بے کسی میں موت کا کیا غم۔ موت تو اسے باعث نجات ہوگی۔ میری حالت اور ہے، زندگی اپنی تمام دل فریبیوں اور رنگینیوں کے ساتھ میری ناز برداری کر رہی ہے، حوصلے ہیں، ارادے ہیں میں اسے کیوں کر خطرے میں ڈال سکتا ہوں۔

میں نے پھر گھوڑے کے ایالوں میں منہ چھپا لیا۔ شتر مرغ کی طرح جو خطرے سے بچنے کی کوئی راہ نہ پا کر بالو میں سر چھپا لیتا ہے۔

(2)

وہ آندھی کی آخری سانس تھی۔ اس کے بعد بتدریج زور کم ہونے لگا۔ یہاں تک کہ کوئی پندرہ منٹ میں مطلع صاف ہو گیا۔ نہ گرد و غبار کا نشان تھا، نہ ہوا کے جھونکوں کا۔ ہوا میں ایک فرحت بخش خنکی آ گئی تھی۔ ابھی مشکل سے پانچ بجے ہوں گے۔ سامنے ایک پہاڑی تھی، اس کے دامن میں ایک چھوٹا موضع تھا۔ میں جوں ہی اس گانو میں پہنچا، وہی عورت ایک بچے کو گود میں لیے میری طرف آ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے پوچھا ''تم کہاں رہ گئے تھے؟ میں ڈری کہ تم رستہ نہ بھول گئے ہو، تمھیں ڈھونڈھنے جا رہی تھی۔''

میں نے اس کی انسانیت سے متاثر ہو کر کہا ''اس کے لیے تمھارا بہت ممنون ہوں۔ آندھی کا ایسا ریلا آیا کہ مجھے رستہ نہ سوجھا۔ میں وہیں کھڑا ہو گیا۔ یہی تمھارا گانو ہے؟ یہاں سے جگن پور کتنی دور ہو گا؟

''بس کوئی دھاپ بھر سمجھ لو۔ راستہ بالکل سیدھا ہے۔ کہیں داہنے بائیں مڑیو نہیں۔ سورج ڈوبتے ڈوبتے پہنچ جاؤ گے''۔

''یہی تمھارا بچّا ہے''

''نہیں ایک اور اس سے بڑا ہے۔ جب آندھی آئی تو دونوں نمبر دار کی چوپال میں جا کر بیٹھے تھے جھونپڑیا کہیں اڑ نہ جائے۔ جب سے آئی ہوں یہ میری گود سے نہیں اترتا، کہتا ہے تو پھر کہیں بھاگ جائے گی۔ بڑا شیطان ہے۔لڑکوں میں کھیل رہا ہے۔ محنت مزدوری کرتی ہوں بابو جی! ان کو پالنا تو ہے۔ اب میرے کون بیٹھا ہوا ہے جس پر ٹیک کروں۔ گھاس لے کر بیچنے گئی تھی۔ کہیں جاتی ہوں، من ان بچّوں میں لگا رہتا ہے۔''

میرا دل اتنا اثر پذیر تو نہیں ہے لیکن اس دہقان عورت کے بے لوث انداز گفتگو، اس کی سادگی اور جذبۂ مادری نے مجھ پر تسخیر کا سا عمل کیا اس کے حالات سے مجھے گونہ دلچسپی ہو گئی۔ پوچھا۔ ''تمھیں بیوہ ہوئے کتنے دن ہو گئے؟''

عورت کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے بچے کے رخسار کو اپنی آنکھوں سے لگا کر بولی:

''ابھی تو کل چھ مہینے ہوئے ہیں بابو جی! بھگوان کی مرضی میں آدمی کا کیا بس۔ بھلے چنگے ہل لے کر لوٹے، ایک لوٹا پانی پیا، قے ہوئی۔ بس آنکھیں بند ہو گئیں۔ نہ کچھ کہا نہ سنا۔ میں سمجھی تھکے ہیں۔ سو رہے ہیں۔ جب کھانا کھانے کو اٹھانے لگی تو بدن ٹھنڈا۔ تب سے بابو! جی گھاس چھیل کر پیٹ پالتی ہوں اور بچوں کو کھلاتی ہوں۔ کھیتی میرے مان کی نہ تھی بیل بدھیے بیچ کر انھیں کے کریا کرم میں لگا دیے۔ بھگوان، تمھارے ان دونوں گلاموں کو جلا دے۔ میرے لیے یہی بہت ہیں۔''

میں موقع اور محل سمجھتا ہوں اور نفسیات میں بھی دخل رکھتا ہوں۔ لیکن اس وقت مجھ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ میں آب دیدہ ہو گیا اور جیب سے پانچ روپے نکال کر اس عورت کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میری طرف سے یہ

بچوں کے مٹھائی کھانے کے لیے لے لو مجھے موقع ملا تو پھر کبھی آؤں گا''۔ یہ کہہ کر میں نے بچے کے رخساروں کو انگلی سے چھو دیا۔ ماں ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی ''نہیں بابو جی، یہ رہنے دیجیے میں غریب ہوں لیکن بھکارن نہیں ہوں۔''

''یہ بھیک نہیں ہے، بچّوں کی مٹھائی کھانے کے لیے ہے۔''

''نہیں بابو جی''

''مجھے اپنا بھائی سمجھ کرے لو''۔

''نہیں بابو جی جس سے بیاہ ہوا ہے اس کی عزت تو میرے ہی ہاتھ ہے۔ بھگوان، تمھارا بھلا کریں۔ اب چلے جاؤ، نہیں دیر ہو جائے گی''۔

میں دل میں خفیف اتنا کبھی نہ ہوا تھا۔ جنھیں میں جاہل، کور باطن، بے خبر سمجھتا تھا، اسی طبقے کی ایک معمولی عورت میں یہ خودداری، یہ فرض شناسی یہ توکّل! اپنے ضعف کے احساس سے میرا دل جیسے پامال ہو گیا۔ اگر تعلیم فی الاصل تہذیب نفس ہے اور محض اعلیٰ ڈگریاں نہیں، تو یہ عورت تعلیم کے معراج پر پہنچی ہوئی ہے۔

میں نے نادم ہو کر نوٹ جیب میں رکھ لیا اور گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے پوچھا، ''تمھیں اس آندھی میں ذرا سا ڈر نہیں معلوم ہوتا تھا؟''

عورت مسکرائی ''ڈر کس بات کا؟ بھگوان تو سبھی جگہ ہیں۔ اگر وہ مارنا چاہیں، تو کیا یہاں نہیں مار سکتے؟ میرا آدمی تو گھر آ کر بیٹھے بیٹھے چل دیا۔ آج وہ ہوتا تو تم اس طرح جگن پورا کیلے نہ جانے پاتے، جا کر تمھیں پہنچا آتا۔ تھوڑی خدمت کرتا۔''

گھوڑا اُڑا، میرا دل اس سے زیادہ تیزی سے اڑ رہا تھا۔ جیسے کوئی مفلس سونے کا ڈلا پا کر دل میں ایک طرح کی پرواز کا احساس کرتا ہے وہی حالت میری تھی۔ اس دہقان عورت نے مجھے وہ تعلیم دی جو فلسفہ اور مابعدالطبیعات کے دفتروں سے بھی نہ حاصل ہوئی تھی۔ میں اس مفلس کی طرح اس سونے کے ڈلے کو گرہ میں باندھتا ہوا ایک غیر مترقبہ نعمت کے غرور سے مسرور، اس اندیشے سے خائف کہ کہیں یہ اثر دل سے مٹ نہ جائے، اڑا چلا جاتا تھا۔ بس یہی فکر تھی کہ اس پارۂ

زر کو دل کے کسی گوشہ میں چھپالوں، جہاں کسی حریص کی اس پر نگاہ نہ پڑے۔

(3)

گجن پور ابھی پانچ میل سے کم نہ تھا۔ راستہ نہایت پیچیدہ، بیہڑ، بے برگ و بار۔ گھوڑے کو روکنا پڑا تیزی میں جان کا خطرہ تھا۔ آہستہ آہستہ سنبھلتا چلا جاتا تھا کہ آسمان پر ابر گھر آیا کچھ کچھ تو پہلے ہی سے چھایا ہوا تھا۔ پر اب اس نے ایک عجیب صورت اختیار کی۔ برق کی چمک اور رعد کی گرج شروع ہوئی۔ پھر افق مشرق کی طرف سے زرد رنگ کے ابر کی اس نئی تہ اس مٹیالے رنگ پر زرد لیپ کرتی ہوئی تیزی سے اوپر کی جانب دوڑتی نظر آئی۔ میں سمجھ گیا اولے ہیں۔ پھاگن کے مہینے میں اس رنگ کے بادل اور گرج کی یہ مہیب گڑگڑاہٹ ژالہ باری کی علامت ہے۔ گھٹا سر پر بڑھتی چلی جاتی تھی۔ یکا یک سامنے ایک کف دست میدان آ گیا۔ جس کے پرلے سرے پر گجن پور کے ٹھاکر دوارے کا کلس صاف نظر آ رہا تھا کہیں کسی درخت کی بھی آڑ نہ تھی۔ لیکن میرے دل میں مطلق کمزوری نہ تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مجھ پر کسی کا سایہ ہے جو مجھے ہر آفت، ہر گزند سے محفوظ رکھے گا۔

ابر کی زردی ہر لمحہ بڑھتی جاتی تھی۔ شاید گھوڑا اس خطرے کو سمجھ رہا تھا۔ وہ بار بار ہنہناتا تھا اور اڑ کر خطرے سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے بھی دیکھا راستہ صاف ہے، لگام ڈھیلی کر دی۔ گھوڑا اڑا، میں اس کی تیزی کا لطف اٹھا رہا تھا۔ دل میں خوف کا مطلق احساس نہ تھا۔

ایک میل نکل گیا ہوں گا کہ ایک رپٹ آ پڑی۔ پہاڑی ندی تھی جس کے پیٹے میں کوئی پچاس گز لمبی رپٹ بنی ہوئی تھی۔ پانی کی ہلکی دھار رپٹ پر سے اب بھی بہہ رہی تھی۔ رپٹ کے دونوں طرف پانی جمع تھا۔ میں نے دیکھا ایک اندھا لاٹھی ٹیکتا ہوا رپٹ سے گزر رہا تھا۔ وہ رپٹ کے کنارے سے اتنا قریب تھا کہ میں ڈر رہا کہ کہیں گر نہ پڑے۔ اگر پانی میں گرا تو مشکل ہوگی کیوں کہ وہاں پانی گہرا تھا میں نے چلّا کر کہا ''بڈھے اور داہنے کو ہو جا۔''

بڈھا چونکا اور گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سن کر شاید ڈر گیا۔ داہنے تو نہیں ہوا اور بائیں طرف ہو لیا اور پھسل کر پانی

میں گر پڑا اسی وقت ننھا سا اولا میرے سامنے گرا۔ دونوں مصیبتیں ایک ساتھ نازل ہوئیں۔

ندی کے اس پار ایک مندر تھا۔ اس میں بیٹھنے کی جگہ کافی تھی۔ میں ایک منٹ میں وہاں پہنچ سکتا تھا۔ لیکن یہ نیا عقدہ سامنے آ گیا۔ کیا اس اندھے کو مرنے کے لیے چھوڑ کر اپنی جان بچانے کے لیے بھاگوں؟ حمیت نے اسے گوارا نہ کیا۔ زیادہ پس وپیش کا موقع نہ تھا، میں فوراً گھوڑے پر سے کودا اور کئی اولے میرے چاروں طرف گرے۔ میں پانی میں کود پڑا۔ ہاتھی ڈباؤ پانی تھا۔ رپٹ کے لیے جو بنیاد کھودی گئی تھی وہ ضرورت سے زیادہ چوڑی تھی۔ ٹھیکے دار نے دس فٹ چوڑی رپٹ تو بنادی مگر کھدی ہوئی مٹی برابر نہ کی۔ بڈھا اسی گڈھے میں گرا تھا۔ میں بھی ایک غوطہ کھا گیا۔ لیکن تیرنا جانتا تھا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ میں نے دوسری ڈبکی لگائی اور اندھے کو باہر نکالا۔ اتنی دیر میں وہ سیروں پانی پی چکا تھا، جسم بے جان ہو رہا تھا۔ میں اسے لیے بڑی مشکل سے باہر نکلا دیکھا تو گھوڑا بھاگ کر مندر میں جا پہنچا ہے اس نیم جان لاش کو لیے ہوئے ایک فرلانگ چلنا آسان نہ تھا۔ اوپر اولے تیزی سے گرنے لگے تھے۔ کبھی سر پر، کبھی شانے پر، کبھی پیٹھ میں گولی سی لگ جاتی تھی۔ میں تلملا اٹھا تھا۔ لیکن اس لاش کو سینے سے لگائے مندر کی طرف لپکا جاتا تھا۔ میں اگر اس وقت اپنے دل کے جذبات بیاں کروں تو شاید خیال ہو میں خواہ مخواہ تعلّی کر رہا ہوں۔ اچھے کام کرنے میں ایک خاص مسرت ہوتی ہے مگر میری خوشی ایک دوسری ہی قسم کی تھی۔ وہ فاتحانہ مسرت تھی۔ میں نے اپنے اوپر فتح پائی تھی۔ آج سے پہلے غالباً میں اس اندھے کو پانی میں ڈوبتے دیکھ کر یا تو اسی راہ چلا جاتا یا پولیس کو رپورٹ کرتا۔ خاص کر ایسی حالت میں جب کہ سر پر اولے پڑ رہے ہوں میں کبھی پانی میں نہ گھستا ہر لحظہ خطرہ تھا کہ کوئی بڑا سا اولا سر پر گر کر عزیز جان کا خاتمہ نہ کر دے مگر میں خوش تھا کیوں کہ آج میری زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز تھا۔

میں مندر میں پہنچا تو سارا جسم زخمی ہو رہا تھا۔ مجھے اپنی فکر نہ تھی۔ ایک زمانہ ہوا میں نے فوری امداد (فرسٹ ایڈ) کی مشق کی تھی وہ اس وقت کام آئی۔ میں نے آدھ گھنٹے میں اس اندھے کو اٹھا کر بٹھا دیا۔ اتنے میں دو آدمی اندھے کو ڈھونڈ ھتے ہوئے مندر میں آ پہنچے۔ مجھے اس کی تیمار داری سے نجات ملی۔ اولے نکل گئے تھے۔ میں نے گھوڑے کی پیٹھ ٹھونکی۔ رومال سے ساز کو صاف کیا اور گجن پور چلا۔ بے خوف بے خطر۔ دل میں ایک غیبی طاقت محسوس کرتا ہوا۔ اسی وقت

اندھے نے پوچھا ''تم کون ہو بھائی، مجھے تو کوئی مہاتما معلوم ہوتے ہو۔''

میں نے کہا ''تمھارا خادم ہوں۔''

''تمھاری سر پر کسی دیوتا کا سایہ معلوم ہوتا ہے۔''

''ہاں ایک دیوی کا سایہ ہے۔''

''وہ کون دیوی ہے۔''

''وہ دیوی پیچھے کے گاؤں میں رہتی ہے۔''

''تو کیا وہ عورت ہے؟''

''نہیں میرے لیے تو وہ دیوی ہے۔''

معنی اور اشارے:

متحدہ	متفق، ملا ہوا
کوہستانی	پہاڑ کا رہنے والا
شگفتگی	خوشی، سرسبزی، پھول کا کھلنا
خیال آرائی	تصور آرا ہونا، فکر آرائی
میل	منار جو کوس کی علامت ہے۔ وہ پتھر جو کوس کے فاصلے پر کھڑا کر دیتے ہیں
مسافت	دوری، فاصلہ، عرصہ، سفر
ملازم	نوکر، خادم
کاشتکار	کسان، مزارع
ربیع	موسم بہار، وہ فصل جو اکتوبر اور نومبر میں بوئی اور مارچ اور مئی میں کاٹی جاتی ہے۔
مزرع	کھیتی، کھیت، کاشت
بوسیدہ	پھٹا، پرانا
جہالت	بے علمی، بے وقوفی
نیم برہنگی	نصف ننگا پن
زرعی	کھیتی، کاشتکاری
اصلاح	درستی، ترمیم، تصحیح
جمود	جم جانا
سلف	گزشتہ، اگلے زمانے کے لوگ

ممنون	احسان مند، شکر گزار
مشعل	چراغ دان، بہت موٹی بتی
اُفق	وہ جگہ جہاں زمین و آسمان ملے ہوئے دکھائی دیتے ہیں
وسیع	چوڑا، کشادہ
الاماں	امن چاہنا، پناہ، رحم
ایال	گھوڑے کی گردن کے لمبے لمبے بال
مسلط	وہ جو کسی پر غالب کر دیا جائے
رقت	نرمی، رونا، وجد، دل بھر آنا
نیزہ	بھالا، بلّم
تحت الثریٰ	زمین کا سب سے نیچے کا طبقہ، پاتال
شترمرغ	افریقہ کا ایک قد آور پرندہ
خنکی	ٹھنڈ، سردی
دہقان	کسان
خفیف	ذلیل، شرمندہ، کم، تھوڑا
نادم	شرمندہ
مسرور	خوش، شادمان
پارۂ زر	سونے کا ٹکڑا
حریص	لالچی
حمیت	غیرت، شرم

فرلانگ	دوسوبیس گز کا فاصلہ۔میل کا آٹھواں حصہ
عقدہ	گرہ، گانٹھ، معمّا، راز

معروضی سوالات:

1۔ پریم چند کا اصل نام کیا تھا؟

(i) نواب رائے　(ii) دھنپت رائے

(iii) لاجپت رائے　(iv) سمپت رائے

2۔ پریم چند کے پہلے افسانوی مجموعہ کا کیا نام ہے؟

(i) پریم پچیسی　(ii) پریم بتیسی

(iii) سوزِ وطن　(iv) واردات

3۔ پریم چند کا سنۂ پیدائش کیا ہے؟

(i) 1880　(ii) 1885

(iii) 1890　(iv) 1875

3۔ افسانہ روشنی پریم چند کے کس افسانوی مجموعہ میں شامل ہے۔

(i) پریم پچیسی　(ii) خاک پروانہ

(iii) واردات　(iv) آخری تحفہ

5۔ کون سا افسانہ پریم چند کا نہیں ہے۔

(i) کفن　(ii) بڑے گھر کی بیٹی

(iii) نمک کا داروغہ　(iv) کالو بھنگی

مختصر ترین سوالات:

1۔ پریم چند کی پہلی کہانی کا نام کیا تھا؟

2۔ پریم چند کے ابتدائی افسانوں میں کون سے عناصر کارفرما رہے ہیں۔

مختصر سوالات:

1۔ پریم چند کے کسی تین افسانوی مجموعوں کے نام لکھیے۔

2۔ پریم چند کے کسی پانچ نمائندہ اور شاہکار افسانوں کے نام لکھیے۔

3۔ پریم چند کی اردو افسانے کو کیا دین ہے؟

تفصیلی سوالات:

1۔ پریم چند کی افسانہ نگاری کی خصوصیات بیان کیجیے۔

2۔ پریم چند کی حالات زندگی اور اسلوب تحریر پر روشنی ڈالیے۔

3۔ افسانوی ادب میں پریم چند کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

4۔ زیر نصاب شامل افسانہ روشنی کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

(7)

مولانا عبدالماجد دریابادی

[پیدائش 1892ء، وفات 1977ء]

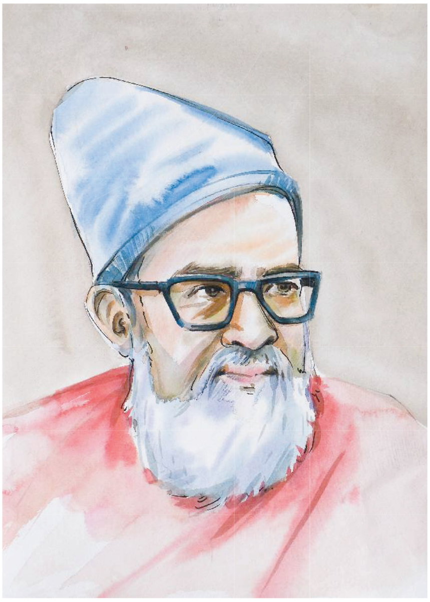

مولانا عبدالماجد دریابادی کی پیدائش 16/مارچ 1892ء میں قصبہ دریاباد کے ایک قدوئی خاندان میں ہوئی جو کہ ہندوستان کے ضلع بارہ بنکی میں ہے۔ آپ کے والد کا نام مولوی عبدالقادر تھا جو ایک ڈپٹی کلکٹر تھے۔ مولانا عبدالماجد نے 1912ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔اے۔ کی تعلیم حاصل کی اور پھر بعد میں ایم۔اے۔ فلسفہ میں داخلہ لیا۔ مگر تنگ دستی کی وجہ سے آگے پڑھائی مکمل نہ کر سکے۔

ان کے دادا مفتی مظہر کریم کو ہندوستان میں انگریزی حکومت کے خلاف فتویٰ دینے پر کالے پانی کی سزا سنائی

گئی۔ مولانا عبدالماجد نے بیسویں صدی کی عظیم الشان ہستیوں میں ہندوستان کے اندر اپنے علم وفن کا سکّہ جمایا۔ مولانا ایک صاحب طرز ادیب، شاعر، ناقد، فلسفی، صحافی اور عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مفسر قرآن بھی تھے۔ مولانا نے نہ صرف علمی، ادبی اور اسلامی خدمات انجام دے کر امتِ اسلامیہ کی خدمت کی بلکہ آپ مشہور علمی اداروں سے منسلک بھی رہے اور ان کی تعمیر اور ترقی میں اہم کردار ادا کیا جن میں دار المصنفین اعظم گڑھ، دارالعلوم دیو بند، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، دارالمعارف عثمانیہ حیدر آباد، انجمن ترقی اردو وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مولانا ایک متبحر عالم اور صاحب طرز ادیب ہیں۔ ان کی زبان صاف، سلیس اور شگفتہ، انداز بیان میں علمیت، فکر ونظر کی گہرائی اور ایک خاص قسم کا وقار ہوتا ہے۔

مولانا کی لکھی کتابوں کی ایک لمبی فہرست ہے، جن میں شبلی نعمانی، ابو الکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، اکبر الہ آبادی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کا اہم حصہ اردو ادب کے نام کر دیا۔ بالآخر 6/جنوری 1977ء کو 84 برس کی عمر میں ابدی نیند سو گئے۔

اکبر کی شاعری کا معاشرتی و اخلاقی پس منظر

اکبر کے صحیفۂ کمال کا روشن ترین عنوان اخلاق و معاشرت ہے۔ ان کی شاعری کی روح یا جان ان کی اخلاقی و معاشری تعلیمات ہیں۔ ابتدائی دور میں تغزل کی شوخیاں غالب تھیں، آخری دور میں تصوف کے خرقہ پوش ہو گئے تھے۔ لیکن دو چیزیں ایسی تھیں جنھوں نے اول سے آخر تک کبھی ساتھ نہ چھوڑا، بلکہ ہر دور میں رفاقت قائم رکھی۔ پیرایۂ ادا کی حد میں انداز بیان کی لطافت و ظرافت اور مفہوم سخن و موضوع کلام کے حدود میں اصلاح معاشرت و تزکیۂ اخلاق جس کا تعلق موضوع سخن و مفہوم کلام سے تھا۔

اکبر کی شاعری کے کمالِ عروج و شہرت کا زمانہ انیسویں صدی عیسوی کا ربع آخر اور بیسویں صدی کا خمس اول ہے۔ یہی زمانہ ہندوستان میں مغربی تمدن، مغربی اخلاق، مغربی معاشرت غرض مغربیت کی انتہائی عروج و شیوع کا ہے۔ اکبر جب دنیا سے روشناس ہوتے ہیں تو ان کے ملک و قوم کی حالت یہ ہے کہ غدر 1857ء کو فرو ہوئے چند سال گذر چکے ہیں۔ ہندوستان بیرونی مداخلت و تسلط کے شکنجے میں پوری طرح کسا ہوا ہے۔ مسلمانوں کی قوم خصوصیت کے ساتھ اپنی شامت اعمال کے نتائج بھگت رہی ہے۔ اسلامی اخلاق، اسلامی آداب، اسلامی شعائر کو رخصت ہوئے مدّت ہو چکی۔ ثروت و خوش حالی کا اول وجود ہی عنقا ہو رہا ہے اور پھر جو کچھ بھی ہے وہ عیاشیوں اور نفس پرستیوں کے لیے وقف ہے۔ تعلیم و تربیت، اتحاد و اتفاق، نظم و انتظام، ضبط و خودداری، ہمت و بلند نظری، صداقت اور حق پرستی، قناعت اور ایثار سے کوئی ایک شے موجود نہیں۔

عقائد میں تزلزل آچکا ہے۔ ایمان کی مضبوطی ایک افسانۂ پارینہ رہ گئی ہے۔ حرص و طمع، مکر و نفاق، خود غرضی، غداری، نفس پروری، عیش پرستی کی گرم بازاری ہے۔ اس کے مقابلے میں برطانیہ کی عظمت کا نقش ہر دل پر بیٹھا ہوا ہے۔ داد خواہی کے لیے انگریزی عدالتیں ہیں، تعلیم کے لیے انگریزی مدرسے ہیں، سفر کے لیے انگریزی سواریاں ہیں۔ علاج کے

لیے انگریزی شفاخانے ہیں۔ رسل ورسائل کے لیے انگریزی ڈاک خانے ہیں، مہاجنی کے لیے انگریزی کوٹھیاں اور بینک ہیں۔ ماضی سے واقفیت کے لیے انگریزوں کی کتابیں ہیں۔ حال سے باخبر رہنے کے لیے انگریزوں کے اخبارات ہیں۔ مستقبل کی پیشین گوئی کے لیے انگریزی سائنس ہے۔ عزت وحکومت کے لیے انگریزی عہدے ہیں۔ حصول زر کے لیے انگریزی پیشے (بیرسٹری، وکالت، ڈاکٹری، انجینئری وغیرہ ہیں)، زینت وآرائش کے لیے انگریزی مصنوعات اور انگریزی بازار ہیں۔ نشاط وتفریح کے لیے انگریزی پارک اور انگریزی تماشے (تھیٹر وغیرہ) ہیں، غرض جس طرف بھی رخ پھرتا حد نظر تک ایک غیر محدود ولامتناہی پرچم انگریزی اقبال کا لہراتا ہوا نظر آتا۔

اپنی اس پستی اور صاحب کی اس بلندی، اپنی خاک نشینی اور صاحب کی فلک پیمائی دیکھ بعض نیک نیت ہم دردان قوم کی، جن کی آنکھیں اس جگمگاہٹ سے خیرہ ہوچکی تھیں، یہ رائے ہوئی کہ جس طرح بھی ممکن ہو اپنی دنیا ''ان کی'' تقلید میں درست کرلی جائے۔ دنیا ٹھیک ہوجائے تو دین بھی درست ہوجائے گا۔ ڈوبتے ہوئے شخص کو جان بچانے کے لیے گھاس کے تنکے کا سہارا کافی نظر آتا ہے۔ تاریکی اور ویرانے میں انسان کو اپنے سائے پر بھوت کا گمان ہوتا ہے۔ سوتے ہوئے شخص کے کمرے میں دفعتاً تیز روشنی کردی جائے تو وہ سمجھے گا کہ آفتاب نکل آیا۔ یہی حال اس وقت قوم کا تھا۔ اضطرار قلب، انتشار خاطر، اختلال حواس واجتماع حوادث کے وقت دیو میں پری کا حسن وجمال معلوم ہوا۔ عجوزۂ ہفتاد سالہ پر نازنین شانزدہ سالہ کا دھوکہ ہوا۔ دیر میں حرم کا تقدس دکھائی دینے لگا۔

اب مغرب کا جادو ساری قوم پر چل گیا۔ علم وفضل کا معیار کمال یہ قرار پایا کہ انگریزی زبان آجائے، تلفظ انگریزوں کا سا ہوجائے اور انگریزی علوم سے واقفیت ہوجائے۔ تہذیب وشائستگی کی معراج یہ ٹھہری کہ کھانا انگریزی کھایا جائے، لباس انگریزی پہنا جائے اور انگریزی تقلید میں خاندان مشترکہ کے وجود کو ذلیل سمجھ کر ضعیف والدین اور دوسرے اعزہ سے قطع تعلق کرلیا جائے۔ شرافت اور عزت کا منتہائے خیال یہ قائم ہوا کہ ہر ممکن ذریعے سے انگریزی عہدے حاصل کئے جائیں۔ انگریزی حکومت کی برکات کا وعظ کہا جائے اور اپنے ہم وطنوں اور ہم قوموں کو نقصان پہنچا کر انگریزی دربار میں رسوخ حاصل کیا جائے۔ عقل ودانش کا مفہوم قرار پایا کہ ہر انگریزی کے قول پر بے چوں وچرا ایمان لے آیا جائے۔

انگریزی قانون، انگریزی فلسفہ، انگریزی سائنس کو ہر قسم کی تنقید و تنقیح سے ماورا سمجھ لیا جائے اور اپنے علوم وفنون، اپنے شعائر ورسوم، اپنے عقائد اور خیالات کو یک سر اوہام کا لقب دے کر انگریزیت کے صنم دل ربا کے قدموں پر نثار کر دیا جائے۔ اردو زبان اس لیے حقیر نظر آنے لگی کہ یہ 'سرکار' کی زبان نہیں۔ پردے کی رسم اس لیے غلامی نسواں کی مرادف معلوم ہونے لگی کہ انگریزی خواتین کا شعار بے حجابی کا ہے۔ تعدد ازدواج کا دستور اس لیے شرمناک محسوس ہونے لگا کہ انگریزی قوم ایک سے زیادہ منکوح بیویاں رکھنے کے ضابطے سے ناآشنا ہے۔ عرش کے انکار پر سب سے قوی دلیل یہ قائم ہوئی کہ انگریزی ہیئت وجغرافیہ کی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں۔ شیاطین، جنات وملائکہ کے وجود کے ابطال کے لیے یہ دلیل قطعی نکلی کہ انگریزی سائنس کسی آلہ کی مدد سے ان کا مشاہدہ نہ کرسکا۔ معجزات کا دعویٰ اس لیے قابل مضحکہ ٹھہرا کہ مل واسپنسر ان کے قائل نہیں۔ نبوت والوہیت کے عقائد میں اس لیے رخنے پڑنے لگے کہ ہکسلے وہیوم متشکک رہے ہیں۔

غرض عرش سے لے کر فرش تک، ذرّہ سے لے کر آفتاب تک علم وعمل، معاشرت اخلاق، عقائد کے دائرہ میں کوئی شے ایسی نہ تھی، جو صاحب کا کلمہ نہ پڑھنے لگی ہو۔ ساری فضا مغربیت کے زہر سے مسموم ہو چکی تھی۔ ''اقبال سرکار'' ''عقل فرنگ'' ''دانایان مغرب'' جیسے فقرے جو اسی دور مرعوبیت کی یادگار ہیں حقائق متعارفہ کی طرح بے تکلف زبانوں پر چڑھ گئے تھے۔ دنیا کی تاریخ میں یہ واقعہ انوکھا نہ تھا۔ سنت الٰہی ہمیشہ یہ رہی ہے کہ جب کسی قوم کی بداعمالیاں حد سے بڑھ جاتی ہیں اور نور ایمان ماند پڑ چکتا ہے تو اس کی آنکھوں کو عیب، ہنر، ظلمت، نور کی اور زخم، مرہم کی شکل میں نظر آنے لگتا ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں پر (اور ایک حد تک دوسری قوموں پر بھی) پوری طرح یہی شامتیں اور بدبختیاں مسلط تھیں۔ نام نہاد مصلحین خود خواب غفلت میں مست تھے۔ سرسید اور ان کے انصار اور رفقا خواب دیکھتے دیکھتے صدا لگاتے کہ ''جس حد تک ممکن ہو انگریز بن جاؤ'' مولانا حالؔی درمیان میں چند لمحوں کے لیے آنکھیں ملتے ہوئے کلمۂ شہادت پڑھنے لگتے ہیں۔ لیکن ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے پھر تھپکیاں دے کر سلا دیتے ہیں۔ اور آس پاس کے سونے والوں کے ہم آواز ہو کر وہ بھی خواب میں برّانے لگتے ہیں۔ مولانا شبلی کے ترکش کا ایک ایک تیر اسی ہدف پر آ کر گرتا ہے۔ ان کے فلسفہ، ان کی ظرافت، ان کی سیاسیات کے دائرے کی معمولی پیائش بھی ممکن نہیں، تاوقتیکہ اس مرکزی نقطۂ نظر پر نظر قائم نہ رکھی جائے۔

یہ رنگ موجود شروع سے تھا۔ رفتہ رفتہ اس میں ارتقا ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ آخر زمانے میں ہر ساز سے یہی نغمہ پیدا ہونے لگا تھا۔ عورتوں کی پردہ دری کے متعلق ان کا یہ مشہور و معروف قطعہ بہت قدیم ہے۔

بے حجاب آئیں نظر چند بیویاں — اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا — کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

قوم کی انتشاری اور اضطرابی حالت خود اپنی ہی شامتِ اعمال کا نتیجہ ہے۔ اس کا نقشہ بھی ان کے قلم کا کھینچا ہوا بہت مدت کا ہے:

مذہب کو لیا تو بحث میں سر ٹوٹا — چاہی اصلاح تو خدا ہی چھوٹا
شکوہ ہم غیر کا کریں کیا اکبر — اپنوں ہی نے ہم کو ہر طرح سے لوٹا

کلیات سوم میں اصلاح معاشرت، تزکیۂ اخلاق، احیائے شعائر اسلامی، تجدید و تہذیب مشرقی کا وعظ سطر سطر میں ملتا ہے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ مولانا حالی کی طرح اکبر نرے واعظ نہیں۔ بظاہر یورپ کے مدمقابل بن کر اکھاڑے میں اترے اور نادیدہ حریف پر پینترے بدل بدل کر خوب خوب وار کیے، لیکن حالت یہ رہی کہ ادھر کسی نے حریف [بمعنی قاصد، پیامبر] کی آمد کا کام لیا اور ادھر پٹا ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ قیاس ہوتا ہے کہ مولانا بھی ساری عمر مصروف خواب ہی رہے بعض خواب ایسے ہوتے ہیں جن میں انسان اٹھ کر چلتا پھرتا اور سارے کام کاج کرتا ہے، لیکن پھر بھی سوتا ہی رہتا ہے اور اس کی تمام حرکات بیداری کی نہیں بلکہ نوم ہی کی ماتحتی میں انجام پاتی رہتی ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت شاید مولوی موصوف کی بھی رہی۔

بہر حال یہ فضا تھی جس میں اکبر نے آنکھیں کھولیں۔ یہ ماحول تھا جس میں انھیں اپنا پیغام پہنچانا تھا۔ وہ رسمی شاعر نہ تھے۔ قافیہ پیمائی ان کا مطمح نظر نہ تھا۔ مشاعروں کے لیے طرحی غزلیں تیار کرنا ان کا جوہر کمال نہ تھا۔ وہ ایک خاص مقصد حیات لے کر آئے تھے۔ ایک مخصوص پیام کی تبلیغ کا بوجھ ان کے شانے پر تھا۔ فطرت کی جانب سے وہ ایک رسول [بمعنی قاصد، پیامبر] ہو کر آئے تھے۔ ان کا پیام اسی تحریک مغربیت کے خلاف ردعمل تھا۔ ان کی شاعری اول سے آخر تک

اسی مادیت اور مغرب پرستی کا جواب ہے۔ وہ پہلے شاعر ہیں، پھر واعظ ہیں۔ پہلے ظریف ہیں۔ پھر معلم اخلاق۔ پہلے نقاش فطرت ہیں پھر مصلح معاشرت۔ ان کی مجلس میں جام شراب کا دور چلتا ہے یخنی کے پیالے تقسیم نہیں [اکبر نے خود ایک جگہ اس خیال کو نظم کیا ہے کہ ''لوگ مجھ میں اور مولانا حالی میں فرق دریافت کرتے ہیں۔ جواب دیتا ہوں کہ شراب اور یخنی کا موازنہ ہی کیا''، افسوس ہے کہ وہ اشعار حافظہ میں نہ رہے۔ اور کسی مطبوعہ کلیات میں موجود نہیں۔] ہوتے۔ یہ اور بات ہے کہ حلق سے اتارنے کے بعد شراب، شراب طہور ثابت ہو۔

یاد ہوگا کہ اکبر سے کچھ قبل بنگال کا ایک نام ور فرزند بنکم چٹر جی بھی یہی مشن لے کر پیدا ہوا تھا۔ تہذیب جدید کے خطرات کا، اس نے پوری طرح اندازہ کرلیا تھا اور بنگالی زبان میں اپنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعے سے اس سیلاب کے روکنے کی اپنے امکان بھر کوشش کی۔ بنکم نے اپنا حربہ نثر کی شمشیر عریاں رکھا۔ اکبر نے اس کے بجائے نظم کے نشتر کو اختیار کیا۔ بنکم کی تلوار کا کاٹ سب نے دیکھا اور اکثروں نے شاباش اور واہ واہ سے ہمت افزائی بھی کی۔ اکبر کا نشتر عموماً زیر آستیں رہا اور لوگوں کی نظروں سے مخفی۔ البتہ اس کی گدگدی اس غضب کی تھی کہ بسمل بجائے کراہنے اور تڑپنے کے اکثر فرط وانبساط سے لوٹنے لگتا ہے۔

جدید تہذیب اور تمدن کا ایک بہت بڑا مظہر آزادی نسواں ہے۔ اس شان دار لفظ کے عقب میں حقیقت عریانی، بے پردگی، بے حجابی اور بے عصمتی کی ہے۔ اکبر کے ترکش کے اکثر تیروں کا ہدف یہی ہے۔

اس تہذیب کا ایک نمایاں کرشمہ یہ ہے کہ جہاں بیوی سے شرم وحیا رخصت ہوچکتی ہے وہاں شوہر سے بھی حمیت وغیرت سلب ہوجاتی ہے۔ اکبر کے نگار خانہ میں یہ مرقع ایک ممتاز مقام پر آویزاں ملے گا:

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں
انھیں پردہ نہیں آتا انھیں غصہ نہیں آتا

یورپ کی عدالتوں میں مقدمات طلاق جس افراط سے دائر ہوتے رہتے ہیں اور ان کے دوران میں جن حیا سوز واقعات کا انکشاف ہوتا رہتا ہے۔ وہاں کے اخبارات جس کثرت سے اور جس لطف وذوق کے ساتھ اسرار خانگی کو طشت

ازبام کرتے رہتے ہیں، وہاں کے ادنیٰ نہیں بلکہ متوسط واعلیٰ طبقات میں بھی ازدواجی زندگی جن دشواریوں، تلخیوں اور حرماں نصیبیوں کا مجموعہ بن کر رہ گئی ہے، یہ سب آزادی نسواں کی برکات ہیں۔

سرکار انگریزی کے طفیل میں ہندوستان بھی ان برکات سے مستفید ہو چلا ہے۔ اب یہاں بھی ایسے واقعات معدوم نہیں ہیں۔ لیکن ابھی چوں کہ احساس حمیت وغیرت بالکل مردہ نہیں ہوگیا ہے اس لیے وقوع واقعہ کے بعد اکثر صورتیں تاسف وندامت کی بھی رونما ہوتی رہتی ہیں یہ کیفیت اکبر کی زبان سے سنئے:

کیا گذری جو اک پردے کے عدو ، رو رو کے پولیس سے کہتے تھے
عزت بھی گئی ، دولت بھی گئی ، بیوی بھی گئی زیور بھی گیا

مشرق میں بہترین عورت کا تخیل یہ تھا کہ گھر کی اندرونی زندگی کی مالک ہو۔ خانہ داری کا اعلیٰ سلیقہ رکھتی ہو، بچپن میں والدین کی اطاعت اپنے لیے باعث شرف سمجھنے اور نکاح کے بعد شوہر کی خوشنودی کو پروانۂ جنت خیال کرے۔ نظام خانگی اس ذات سے درست رہے خاندان کی مسرتیں اس کے دم سے قائم رہیں اور اولاد کو تربیت کے بہتر راستے پر ڈال سکے۔ شوہر کی عزت ومحبت، بڑوں کی تعظیم وخدمت گزاری اور چھوٹوں کی الفت وشفقت کے جذبات لے کر دنیا میں آنکھ کھولے اور انھیں جذبات کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو۔ مغرب میں عورت کا معیار عزت اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس کے نزدیک عورت کا یہ مشرقی تخیل عورت کے لیے باعث توہین وتحقیر ہے۔ فرہنگ مغرب میں الفاظ اطاعت وخدمت گزاری محکومی وغلامی کے مرادف ہیں۔ فرنگیوں کا قول ہے کہ عورت اطاعت کے لیے نہیں حکومت کے لیے آتی ہے۔ اس کا کام یہ نہیں کہ گھر کے اندر پڑی سڑا کرے اور ہر وقت شوہر کے پاس گھٹ گھٹ کر رہا کرے۔ بہترین عورت وہ ہے جس کے حسن گفتار، حسنِ رفتار، حسن صورت، حسن سیرت، باکمال رقص کے کارنامے منظر عام پر آتے رہیں، جس کے فوٹو اخبارات میں شائع ہوتے رہیں اور جس کا تذکرہ زبانوں میں حلاوت اور جس کا نظارہ آنکھوں میں تراوٹ پیدا کرتا ہے۔ بہترین عورت وہ نہیں جو شوہر کی بہترین مونس وغم گسار ہو، بلکہ وہ ہے جس کی زمزمہ سنجی، جس کی نفاست وشائستگی اور جس کی رعنائی ودل ربائی کے نقوش ہر کلب کے در ودیوار، ہر پارک کے سبزہ زار اور ہر ہوٹل کے فرنیچر پر ثبت ہوں۔

''ہمارے'' اور ''ان'' کے اس فرق تخیل کو اقلیم الفاظ و معانی کا یہ تاج دار صرف دو لفظوں میں جس جامعیت، جس صداقت اور جس بلاغت کے ساتھ بیان کر جاتا ہے یہ اسی کا حصہ تھا:

حامدہ چمکی نہ تھی ، انگلش سے جب بیگانہ تھی ‏ ‏ ‏ ‏ اب ہے شمع انجمن ، پہلے چراغ خانہ تھی

''چمکی'' میں جو بلاغت ہے اس کا لطف اردو زبان داں ہی لے سکتا ہے۔ یہ چمک مخصوص نئی روشنی کا فیض ہے۔ پرانے چراغوں کی روشنی میں چمک دمک کہاں۔ شرم و حیا کا دور ہونا، اکتساب ہنر، دنیا کی دل ستانی کی غرض سے کرنا، اپنے تیئں فیشن کے سانچے میں ڈھالنا، یہ سارا مفہوم اور اس سے بہت کچھ زائد ''چمکی'' کے لفظ سے ادا ہو جاتا ہے اور ''شمع انجمن''، ''چراغ خانہ'' کی تشبیہات تو اس قدر چست ہیں کہ ان سے روشن تر تشبیہ خیال میں بھی نہیں آتی۔

معنی اور اشارے:

تغزل	غزل کہنا، غزل کا عاشقانہ رنگ
تصوف	علم معرفت، دل سے خواہشوں کو دور کر کے خدا کی طرف دھیان لگانا، تزکیۂ نفس کا طریقہ
رفاقت	ساتھ، محبت، دوستی
تزکیۂ اخلاق	اخلاق کو پاک کرنا
روشناس	جان پہچان والا
مداخلت	دخل دینا، دست اندازی
تسلط	غلبہ، حکومت، زور
قناعت	تھوڑی چیز پر رضامندی
تزلزل	ہلنا، جنبش، ہلچل
پارینہ	گزرا ہوا، کہنہ، قدیم
حرص وطمع	لالچ، ہوس
تقلید	پیروی، نقل
اضطرار	بے اختیاری، مجبوری
انتشار	پراگندگی، بے ترتیبی، بدنظمی
اختلال حواس واجتماع	حواس میں فتور آنا، حواس باختہ ہونا
تقدس	پاکیزگی
مرادف	کسی کے پیچھے بیٹھے یا سوار ہونے والا

منکوح	جس کا نکاح کیا گیا ہو
ابطال	باطل کرنا، تردید کرنا
متشکک	شک کرنے والا، شبہ میں مبتلا
افراط	فراوانی، کثرت
انکشاف	اظہار، افشائے پردہ داری
خانگی	گھریلو، گھر سے متعلق، گھر کا
اطاعت	تعمیلِ حکم، فرماں برداری
اکتساب	کمائی، کمانا، حاصل کرنا، سیکھنا

معروضی سوالات:

1۔ اکبر کے صحیفۂ کمال کا روشن ترین عنوان ہے۔

(i) اخلاق ومعاشرت (ii) انسان وانسان دوست

(iii) روحانیت (iv) ادبیات

2۔ اکبر کے خیال میں کس کا جادو ساری قوم پر چل چکا تھا۔

(i) مغرب (ii) مشرق

(iii) شمال (iv) جنوب

3۔ فرش سے لے کر عرش تک ذرے سے لے کر آفتاب تک کس کا کلمہ پڑھا جانے لگا؟

(i) اصنام مغربی (ii) اصنام مشرقی

(iii) ہندوستانی تہذیب (iv) انگریزی تہذیب

4۔ مذہب کولیا تو بحث میں سر ٹوٹا / چاہی اصلاح تو خدا ہی چھوٹا یہ شعر کس کا ہے۔

(i) اکبرؔ (ii) جگرؔ

(iii) فراقؔ (iv) فیضؔ

5۔ اکبر کے پیام کا ردِ عمل کس تحریک کے خلاف تھا۔

(i) مغرب (ii) مشرقی

(iii) ہندوستانی (iv) ان میں سے کوئی نہیں

مختصر ترین سوالات:

1۔ اکبر کا پورا نام کیا تھا؟

2۔ ان کی شاعری کا دور کب سے کب تک رہا؟

3۔ اکبر کا کلام کس نام سے شائع ہوا؟

4۔ اکبر الہ آبادی کا کلام کتنے حصوں میں شائع ہوا؟

5۔ ایسی دو چیزیں اکبر کے کلام میں کیا تھیں جو ان کے کلام میں شروع سے آخر تک پائی جاتی ہیں؟

6۔ اکبر کی تحریر کا روشن ترین عنوان کیا تھا؟

مختصر سوالات:

1۔ اکبر کے دور میں معاشرے پر مغربی یا مشرقی تمدن کا کیا اثر تھا؟

2۔ جدید تہذیب اور تمدن کا سب سے بڑا اثر اکبر کے کلام میں کیا دکھائی دیتا ہے؟

3۔ اکبر کا اپنی قوم کے لوگوں کو کیا پیغام تھا؟

تفصیلی سوالات:

1۔ اکبرالہ آبادی کی خدمات کے دور کو کتنے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے؟ تفصیل سے بیان کیجیے۔

2۔ مندرجہ ذیل کا مطلب اپنی زبان میں لکھیے۔

”بعض خواب ایسے ہوتے ہیں جن میں انسان اٹھ کر چلتا پھرتا اور سارے کام کرتا ہے لیکن پھر بھی سوتا ہی رہتا ہے۔“

3۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے حالات زندگی پر مختصر نوٹ لکھیے۔

(8)

مرزا فرحت اللہ بیگ

[پیدائش 1882ء، وفات 1947ء]

مرزا فرحت اللہ بیگ یکم ستمبر 1882ء کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی پیدائش کی تاریخ الگ الگ جگہوں پر الگ الگ لکھی گئی ہیں۔ مگر فرحت نے ایک لٹریری میگزین جو حیدر آباد سے شائع ہوئی تھی، میں اپنی پیدائش کی تاریخ ۳۰ر اگست 1885ء لکھا ہے۔ ان کے والد کا نام مرزا حشمت اللہ بیگ اور والدہ کا نام مشرف جہاں بیگ تھا۔ ان کے پیدائش کے ۱۰ر دن بعد ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ فرحت کی پرورش ان کی پھوپھی حسن جہاں بیگم نے کی۔ فرحت نے اپنی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور پھر مدرسہ کی تعلیم مکمل کر کے انٹر کا امتحان دہلی ہندو کالج سے پاس کیا۔ سینٹ جوزف کالج سے 1905ء میں بی۔ اے پاس کیا۔ ایم۔ اے میں داخلہ لیا مگر مالی حالت اچھی نہ ہونے کی وجہ سے پڑھائی مکمل نہ کر سکے اور تعلیم چھوڑ کر 1907ء میں حیدر آباد چلے گئے۔ حیدر آباد میں معلّم ہوئے۔ اس کے بعد دہلی ہائی کورٹ میں مترجم ہوئے۔ 1939ء میں ہائی کورٹ کا امتحان پاس کر جج بنے۔ فرحت نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی نسیمہ سلطانہ کے انتقال کے بعد ان کی بہن حمیدہ سلطانہ سے نکاح کیا۔ فرحت اللہ بیگ کی وفات 1947ء میں ہوئی اور سرائے الٰہی چمن میں مدفون کئے گئے۔ 1919ء میں انھوں نے اپنا پہلا مضمون رسالہ 'افادہ' آگرہ میں لکھا اور 1923ء سے باقاعدہ مضمون لکھنے لگے۔ انھوں نے تنقید، افسانہ، سوانح حیات کے علاوہ اخلاقیات و معاشرت کے موضوع پر مضامین لکھے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین سات جلدوں میں ''مضامین فرحت'' کے نام سے شائع ہوئے۔ نظم کا مجموعہ 'میری شاعری' کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اس میں مزاحیہ رنگ نمایاں ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کا ایک مخصوص رنگ

ہے جسے عظمت اللہ بیگ نے 'خوش مجازی' کہا ہے۔ مرزا کی مزاح نگاری میں دلّی کے روزمرّہ اور محاورات کا لطف پایا جاتا ہے۔ وہ اکثر ایسے محاورات اور الفاظ اپنی تحریر میں لاتے ہیں جو دلّی کے لوگ گفتگو میں استعمال کرتے ہیں۔ فرحت جب بھی دلّی آئے اس میں انھیں نت نئی تبدیلیاں نظر آئیں۔ فرحت پرانی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ انھیں یہ تبدیلیاں گراں گزرتی تھیں یہی وجہ ہے کہ فرحت نے اپنی تحریروں میں پرانی تہذیب کو محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ سبق فرحت اللہ بیگ کے مشہور مضمون ''۱۳۸۹ھ کا ایک یادگار مشاعرہ'' سے منتخب کیا گیا ہے جو محض خیالی یعنی فرضی ہے۔ اس میں ایک فرضی کردار 'کریم الدین' کی معرفت فرحت اللہ بیگ نے اپنے مخصوص انداز میں ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ سے روبرو کرایا ہے۔

ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ سے ملیے

(1) استاد ذوقؔ

کابلی دروازے کے پاس ہی ان کا مکان ہے۔ مکان بہت چھوٹا ہے۔ چھوٹی سی ڈیوڑھی ہے۔ اس میں ایک طرف جاے ضرور ہے۔ اندر صحن اِتنا چھوٹا کہ دو پلنگ بچھنے کے بعد راستہ چلنے کے لیے مشکل سے جگہ رہتی ہے۔ سامنے چھوٹا سا دالان ہے اور اس کے اوپر ایک کمرہ۔ صحن میں سے زنانے مکان میں راستہ جاتا ہے۔ جب میں پہنچا تو استاد صحن میں بان کی کُھرّی چارپائی پر بیٹھے حقّہ پی رہے تھے، دوسری چارپائی پر ان کے چہیتے شاگرد حافظ غلام رسول ویرانؔ بیٹھے تھے۔ یہ اندھے ہیں اور اِنھی سے ہوشیار رہنے کے لیے حضرت جہاں پناہ نے ارشاد فرمایا تھا۔ استاد ذوق قد و قامت میں متوَسِّط اندام ہیں۔ رنگ اچھا سانولا ہے۔ چہرے پر چیچک کے بہت داغ ہیں۔ آنکھیں بڑی بڑی اور روشن اور نگاہیں تیز ہیں، چہرے کا نقشہ کھڑا کھڑا ہے، اس وقت سفید تنگ پائجامہ، سفید کرتا اور سفید ہی انگرکھا پہنے ہوئے تھے، سر پر ململ کی ٹوپی گول چَندوے کی تھی۔ میرا صحن میں قدم رکھنا تھا کہ میرے پانو کی آہٹ سنتے ہی حافظ ویرانؔ نے چونک کر کہا: کون ہے؟ میں نے کہا: کریم الدین، استاد ذوقؔ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ استاد نے اپنا نام سن کر کہا: آیئے آیئے اندر تشریف لایئے۔ میں نے آداب عرض کیا۔ انھوں نے فرمایا: بیٹھو بھئی بیٹھو۔ میں حافظ ویرانؔ کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کہا: فرمایئے کہ کیسے تشریف لانا ہوا؟ میں نے عرض کی کہ میرا ارادہ قاضی کے حوض پر ایک مشاعرہ شروع کرنے کا ہے، ۱۴ر رجب تاریخ مقرر ہوئی ہے، اگر حضور بھی از راہِ ذرّہ نوازی قدم رنجہ فرمائیں تو بعید از کرم نہ ہوگا۔ میرا اتنا کہنا تھا کہ حافظ ویرانؔ تو چراغ پا ہو گئے، کہنے لگے: جایئے جایئے، کہاں کا مشاعرہ نکالا ہے، استاد کو فرصت نہیں ہے، ان مرزا لے پالک کے پاس کیوں نہیں جاتے، جو خواہ مخواہ اِن کو آ کر دق کرتے ہو [ان دنوں دہلی میں لوگوں نے یہ اڑا رکھا تھا کہ مرزا نوشہ (غالب) مرزا عبداللہ بیگ کے بیٹے ہیں۔ بلکہ انھوں نے ان کو پال لیا ہے۔ اور یہ دراصل کسی کشمیری کی اولاد ہیں۔ حافظ ویران نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ خدا محفوظ رکھے دلی والوں سے جو باہر سے آیا اس کے حسب ونسب میں انھوں نے کیڑے ڈالے۔ استاد ذوقؔ کو شہر بھر

نائی کہتا ہے، دوسری بات ہے کہ آزاد مرحوم نے ان کے ہاتھ میں استرے کے بجائے تلوار دے کر ان کو سپاہی زادہ بنایا ہے۔] استاد نے کہا: بھئی حافظ ویران! تمھاری زبان نہیں رکتی، بیٹھے بٹھائے تم دنیا سے لڑائی مول لیتے ہو۔ حافظ ویران کہنے لگے: استاد! جب وہ آپ کو برا بھلا کہیں تو ہم کیوں چپ بیٹھنے لگے۔ وہ ایک کہیں گے تو ہم سو سنائیں گے اور تو اور میاں آشفتہ کو دن لگے ہیں کل ہی کی بات ہے کہ آپ کو نادڑا کہہ رہے تھے؛ مگر میں نے بھی ایسی خبر لی کہ تمام عمر یاد کریں گے، ان کی سات پشت کو تو م ڈالا۔ استاد ہنس کر فرمانے لگے: نا بھئی نا، تم میری وجہ سے کیوں بلا میں پڑتے ہو۔ مجھے جس کا جو جی چاہے کہے۔ میں نے اُن سب کا جواب اس رباعی میں دے دیا ہے۔

تو بھلا ہے تو بُرا ہو نہیں سکتا اے ذوقؔ! ہے برا وہ ہی کہ جو تجھ کو برا جانتا ہے
اور جو خود تو ہی برا ہے تو وہ سچ کہتا ہے کیوں برا کہنے سے اس کے تو برا مانتا ہے

میں نے عرض کیا کہ میں کل بارگاہِ سلطانی میں حاضر ہوا تھا، حضرت ظلؒ اللہ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اس مشاعرے میں ہم مرزا فتح الملک بہادر کو اپنی طرف سے بھیجیں گے اور اپنی غزل بھی بھیج کر مشاعرے کی عزت بڑھائیں گے۔ یہ سن کر حافظ ویرانؔ تو ٹھنڈے پڑ گئے، اُستاد نے فرمایا: ہاں بھئی مجھے یاد آ گیا، کل شام کو حضرت پیر و مرشد نے مجھ سے بھی فرمایا تھا اور یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ تو بھی ضرور جائیو۔ میاں میں ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور آؤں گا۔ مگر یہ تو بتاؤ طرح کیا رکھی ہے؟ میں نے واقعہ عرض کیا اور کہا کہ حضرت ظلِ سبحانی نے ''طرح'' کا جھگڑا ہی نکال دیا ہے۔ جو شخص جس بحر اور جس ردیف قافیے میں چاہے، آ کر غزل پڑھے۔ استاد تو ''بہت خوب، بہت خوب'' کہتے رہے، مگر حافظ ویرانؔ کی تیوری کے بل نہیں گئے، برابر بڑبڑاتے ہی رہے کہ اللہ خیر کرے۔ دیکھیے اس مشاعرے کا کیا حشر ہوتا ہے۔ حضرت پیر و مرشد بھی بیٹھے بیٹھے اُشقُلے چھوڑا کرتے ہیں۔ وہ اپنی کہے گئے، میں تو اٹھ، سلام کر چلا آیا۔

(2) مرزا غالبؔ

دوسرا حملہ اسد اللہ خاں غالبؔ پر تھا۔ چاندنی چوک سے ہوتا ہوا بلی ماروں میں آیا۔ حکیم محمود خاں صاحب کے

مکان کے سامنے قاسم جان کی گلی گٹی ہے۔ بائیں طرف پہلا ہی مکان ان کا تھا۔ یہ مکان مسجد کے پیچھے ہے اس کے دو دروازے ہیں: ایک مردانہ، دوسرا زنانہ۔ محل سرا کا ایک راستہ مردانے مکان میں سے بھی ہے۔ باہر کے دروازے کی دہلیز ذرا دھنسی ہوئی سی ہے۔ دروازے کے اوپر ایک کمرا ہے اور کمرے کے دونوں پہلوؤں میں دو کوٹھریاں؛ گرمی میں مرزا صاحب دوپہر کے وقت اسی کوٹھری میں رہا کرتے ہیں۔ دروازے سے گذر کر مختصر سا صحن ہے اور سامنے ہی دالان در دالان۔ جب میں پہنچا تو اندر کے دالان میں گاو تکیے سے لگے بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔

مرزا نوشہ کی عمر کوئی پچاس سال کی ہوگی۔ حسین اور خوش رو آدمی ہیں۔ قد اونچا اور ہاڑ بہت چوڑا چکلا۔ موٹا نقشہ اور سرخ سفید رنگ ہے، لیکن اُس میں کچھ کچھ زردی جھلکتی ہے۔ ایسے رنگ کو محاورے میں چمپئی کہا جاتا ہے۔ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ہیں، ڈاڑھی بھری ہوئی ہے، مگر گھنی نہیں ہے، سر مُنڈا ہوا، اُس پر لمبی سیاہ پوستین کی ٹوپی ہے جو کُلاہ پاپاخ سے ملتی جلتی ہے، ایک برکا سفید پیجامہ، سفید ململ کا انگرکھا، اس پر ہلکی زرد زمین کی جامہ دار چغا۔ میری آہٹ پا کر لکھتے لکھتے آنکھ اونچی کی۔ میں نے آداب کیا۔ سلام کا جواب دیا اور آنکھوں سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ نواب ضیاء الدّین احمد خاں آ گئے۔ یہ امین الدین خاں صاحب نواب لوہارو کے بھائی ہیں۔ ریختے میں رخشاںؔ اور فارسی میں نیّرؔ تخلص کرتے ہیں۔ کوئی چالیس سال کی عمر ہے۔ انشا پردازی، جغرافیہ، تاریخ علم الانساب، اَسماء الرِّجال، تحقیقِ لُغات اور واقفیتِ عامّہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مرزا نوشہ کے خلیفہ ہیں۔ چھوٹا قد، بہت گورا رنگ، نازک نازک نقشہ، غلانی آنکھیں، چُگّی ڈاڑھی، چھریرا بدن، غرض نہایت خوبصورت آدمی ہیں۔ ایک برکا سفید پیجامہ اور سفید ہی انگرکھا زیب بدن تھا۔ قالب چڑھی ہوئی چوگوشیہ ٹوپی سر پر تھی۔ ایک بڑا رومال سموسا بنا کر شانوں پر ڈالے ہوئے تھے۔ میں نے اٹھ کر سلام کیا۔ انھوں نے بڑھ کر مصافحہ کیا اور خاموش ایک طرف دوزانو نہایت ادب سے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں مرزا غالبؔ بھی لکھنے سے فارغ ہوئے۔ پہلے نواب صاحب کی طرف مُڑے اور کہنے لگے: میاں نیّرؔ! تم کس وقت آ بیٹھے۔ بھئی اِس مرزا تفتہؔ نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ ظالم کی طبیعت کی روانی کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ ہر خط میں آٹھ دس غزلیں اِصلاح کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ اصلاح دیتے دیتے تھک جاتا ہوں۔ میری طرف دیکھ کر کہا: آپ شاید مولوی کریم الدین

صاحب ہیں۔ میں نے کہا: جی ہاں۔فرمانے لگے: حضرت! آپ کے تشریف لانے کا مقصد مجھے پہلے ہی سے معلوم ہو گیا تھا۔کل میاں عارفؔ آکر مجھ سے آپ کے مشاعرے میں چلنے کا وعدہ لے گئے ہیں۔ کہو میاں نیّرؔ! تم بھی چلو گے۔نواب صاحب نے کہا: جہاں آپ وہاں میں، آپ تشریف لے جائیں گے تو ان شاء اللہ میں بھی ضرور ہمراہ ہوں گا۔ مرزا صاحب نے پوچھا: مگر بھئی اب تک علائیؔ نہیں آئے، مجھ کو ان کا کل سے انتظار ہے۔اے لو، آ ہی گئے۔ بھئی بڑی عمر ہے، ابھی میں تم ہی کو پوچھ رہا تھا۔

(3) مومن خاں مومنؔ

حکیم صاحب کا مکان چیلوں کے کوچے میں ہے۔ راستے میں مولوی امام بخش صاحب صہبائیؔ مل گئے، یہ کالج میں میرے استاد رہے ہیں۔کھلا ہوا گندم گوں رنگ ہے۔ منہ پر کہیں کہیں چیچک کے داغ ہیں، سر پر پٹھے ہیں، بڑے دبلے پتلے آدمی ہیں، کوئی چالیس سال کی عمر ہوگی۔ ایک بر کا سفید پیجامہ، سفید انگرکھا، کشمیری کام کا جُبّہ پہنتے اور سر پر چھوٹا سفید صافہ باندھتے ہیں۔ یہ بھی چیلوں کے کوچے ہی میں رہتے ہیں۔ مجھ سے پوچھنے لگے: کہاں جاتے ہو؟ میں نے کہا: حکیم مومن خاں کے پاس۔ پوچھا: کیا کام ہے؟ میں نے حال بیان کیا۔ کہنے لگے: چلو میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔حکیم آغا جان کے چھتّے کے سامنے خاں صاحب کا مکان تھا۔ بڑا دروازہ ہے۔ اندر بہت وسیع صحن اور اس کے چاروں طرف عمارت ہے۔دو طرف دو صحنچیاں ہیں اور سامنے بڑے بڑے دالان در دالان۔پچھلے دالان کے اوپر کمرا ہے۔سامنے کے دالان کی چھت کو کمرے کا صحن کر دیا ہے، لیکن منڈیر بہت چھوٹی رکھی ہے۔ دالانوں میں چاندنی کا فرش ہے۔اندر کے دالان میں بیچوں بیچ قالین بچھا ہوا ہے، قالین پر گاؤ تکیے سے لگے حکیم صاحب بیٹھے ہیں۔سامنے حکیم سکھانند المتخلّص بہ رقمؔ اور مرزا رحیم الدین حیاؔ مؤدب دوزانو بیٹھے ہیں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دربار ہو رہا ہے کہ کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے اور بلا ضرورت بولنے کا یارا نہیں۔

حکیم مومنؔ خاں کی عمر تقریباً چالیس سال کی تھی۔ کشیدہ قامت تھے، سرخ و سفید رنگ تھا، جس میں سبزی جھلکتی

تھی۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں، لمبی لمبی پلکیں، کھنچی ہوئی بھویں، لمبی ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ ان پر پان کا لاکھا جما ہوا، مسّی آلودہ دانت، ہلکی ہلکی مونچھیں، خشخاش ڈاڑھی، بھرے بھرے بازو پتلی کمر، چوڑا سینہ، لمبی لمبی انگلیاں، سر پر گھونگروالے لمبے لمبے بال، زلفیں بن کر پشت اور شانوں پر بکھرے ہیں۔ کچھ لٹیں پیشانی کے دونوں طرف کاکلوں کی شکل رکھتی ہیں۔ کانوں کے قریب تھوڑے سے بالوں کو موڑ زلفیں بنالیا تھا۔ بدن پر شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا تھا لیکن اس کے نیچے کرتا نہ تھا اور جسم کا کچھ حصہ انگرکھے کے پردے میں سے دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ، اس میں چھوٹا سا سنہری تعویذ۔ کاکریزی رنگ کے دوپٹے کو بل دے کر کمر میں لپیٹ لیا تھا اور اس کے دونوں سرے سامنے پڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں پتلا سا خار پشت، پانو میں سرخ گل بدن کا پیجامہ۔ مہریوں پر سے تنگ، اوپر جا کر کسی قدر ڈھیلا۔ کبھی کبھی ایک برکا پیجامہ بھی پہنتے تھے، مگر کسی قسم کا بھی ہو، ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا۔ چوڑا سرخ نیفہ۔ انگرکھے کی آستینیں آگے سے کٹی ہوئیں، کبھی لٹکتی رہتی تھیں اور کبھی پلٹ کر چڑھا لیتے تھے۔ سر پر گلشن کی دوپلڑی ٹوپی، اس کے کنارے پر باریک لیس، ٹوپی اتنی بڑی تھی کہ سر پر اچھی طرح منڈھ کر آگئی تھی۔ اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھ حصہ اور بال صاف جھلکتے تھے۔ غرض یہ کہ نہایت خوش پوشاک اور جامہ زیب آدمی تھے۔ جب میں اور مولوی صہبائی دونوں پہنچے تو حکیم صاحب صاحب عالم مرزا رحیم الدین حیاؔ سے کہہ رہے تھے: صاحب عالم! تمھارے شطرنج کے نقشوں نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ ایک ہوں، دو ہوں، آخر یہ روز روز کی فرمایشیں کوئی کہاں تک پوری کرے۔ صاحبِ عالم نے کہا: اُستاد! کیا کروں۔ رزیڈنٹ بہادر کے پاس ولایت سے شطرنج کے نقشے حل کرنے کو آیا کرتے ہیں۔ کچھ تو میں خود حل کر کے ان کے پاس بھیج دیتا ہوں، جو سمجھ میں نہیں آتے وہ آپ کے پاس لے آتا ہوں۔ حکیم صاحب نے نظر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا، ہمارا سلام لے کر کہا: بیٹھئے بیٹھئے! ہم بیٹھ گئے اور وہ پھر صاحب عالم کی طرف متوجہ ہو کہ کہنے لگے: ارے بھئی صہبائی! تم تو کئی دن سے نہیں آئے، کہو خیریت تو ہے، اور آپ کے ساتھ یہ صاحب کون ہیں؟ مولوی صہبائی نے کہا: یہ پہلے کالج میں میرے شاگرد تھے، اب مطبع کھول لیا ہے، وہاں مشاعرہ کرنا چاہتے ہیں، آپ کو تکلیف دینے آئے ہیں۔ حکیم صاحب نے کہا: بس صاحب مجھے تو معاف ہی کیجئے، اب دہلی کے مشاعرے شریفوں کے جانے کے قابل نہیں رہے۔ ایک صاحب ہیں وہ اپنی اُمّت کو لے کر

چڑھ آتے ہیں۔ شعر سمجھنے کی تو کسی کو تمیز نہیں، مفت میں ''واہ واہ، سبحان اللہ'' کا غل مچا کر طبیعت کو منغص کر دیتے ہیں یہ نہیں سمجھتے کہ:

صائبؔ! دو چیز می سکند قدرِ شعر را
تحسینِ ناشناس و سکوتِ سخن شناس

دوسرے صاحب ہیں، وہ ہُد ہُد کو ساتھ لیے پھرتے ہیں اور خواہ مخواہ استادوں پر حملے کراتے ہیں۔ خود تو میدان میں نہیں آتے، اپنے نااہل پٹھوں کو مقابلے میں لاتے ہیں۔ اُس روز جو اُس جانور نے یہ شعر پڑھ کر:

مرکزِ محورِ گردوں بہ لبِ آب نہیں
ناخنِ قوسِ قزح شبہۂ مضراب نہیں

کہا: یہ غالب کے رنگ میں لکھا ہے تو میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھ کو کس قدر ناگوار گذرا۔ غالبؔ کے رنگ میں شعر کہنا تو کجا، وہ یا اُن کے اُستاد پہلے مرزا نوشہ کے شعروں کو سمجھ تو لیں۔ اب رہے میر صاحب تو ان کی بات تو دوسری ہے۔ وہ بھی واہیات بکتے ہیں۔ مگر کسی پر حملہ نہیں کرتے بلکہ ان کی وجہ سے مشاعرے میں کچھ چہل پہل ہو جاتی ہے۔ بھئی میں نے تو اسی وجہ سے مشاعروں میں جانا ہی ترک کر دیا ہے۔ میں نے عرض کی: اس مشاعرے میں استاد ذوقؔ اور مرزا نوشہ نے آنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ حضرت ظلِ سبحانی کی غزل بھی آئے گی۔ فرمایا: ہر شخص مختار ہے، خود آئے، چاہے غزل بھیجے؛ میں تو نہ آؤں گا نہ غزل بھیجوں گا۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک بنارس کا سوداگر کپڑوں کے دو گٹھّے لے کر آیا۔ شہر میں جب کوئی کپڑوں کا سوداگر آتا تو حکیم صاحب کے پاس اُس کا آنا لازمی تھا۔ ریشمی کپڑوں سے اُن کو عشق تھا۔ کوئی کپڑا پسند آتا تو پھر قیمت کی پروا نہیں کرتے تھے۔ جو مانگتا دیتے۔ اُس سوداگر نے آکر ایک گٹھری مزدور کے سر پر سے اُتاری، اُس میں سے پٹ سے ایک چھپکلی نیچے گری اور دوڑ کر سامنے کی دیوار پر چڑھ گئی۔ جو چھپکلی پہلے سے دیوار پر جمی بیٹھی تھی وہ لپک کر اُس سے آملی اور دونوں مل کر ایک چلی گئیں۔ ہم لوگ بیٹھے یہ تماشا دیکھتے رہے۔ جب دونوں چھپکلیاں چلی گئیں تو حکیم صاحب نے کہا: میاں رَقم! تم نے دیکھا! انھوں نے کہا: جی ہاں! ایک خانے کا حساب لگانے میں مجھ سے غلطی ہوئی میں

نے جو اپنی رائے پر اصرار کیا تھا اُس کی معافی چاہتا ہوں۔ کہنے لگے: اِس کا خیال نہ کرو انسان ہی سے غلطی ہوتی ہے۔ ہاں تو میاں صہبائی مشاعرے کے متعلق ہمارا تو صاف جواب ہے۔ میں نے جب دیکھا کہ خاں صاحب ہاتھوں سے نکلے ہی جارہے ہیں تو مجھے نواب زین العابدین خاں صاحب کا آخری نسخہ یاد آیا، میں نے کہا: مجھے تو اس مشاعرے سے برائے نام تعلق ہے، سب کیا دھرا نواب زین العابدین خاں عارفؔ کا ہے۔ وہ بہت بیمار ہو گئے ہیں اور ان کو اب زندگی کی امید نہیں رہی۔ ان کی آخری خواہش ہے کہ مرتے مرتے ایک ایسا مشاعرہ دیکھ لیں جس میں دہلی کے تمام کاملینِ فن جمع ہوں۔ وہ خود حاضر ہوتے مگر حکیم احسن اللہ خاں صاحب نے ان کو کہیں آنے جانے سے منع کر دیا ہے۔ یہ آخری فقرہ میں نے اپنی طرف سے بڑھا دیا۔ خاں صاحب بڑے غور سے میری بات سنتے رہے۔ میں خاموش ہوا تو مولوی امام بخش صاحب کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے: افسوس ہے! کیا خوش فکر اور ذہین شخص ہے، یہ عمر اور مایوسی۔ سچ ہے ہمیشہ رہے نام اللہ کا! میری طرف دیکھ کر کہا: اچھا بھئی تم جاؤ میری طرف سے عارفؔ سے کہہ دینا کہ میاں میں ضرور آؤں گا۔ میں نے دیکھا کہ یہ جادو چل گیا تو اور پانو پھیلائے اور کہا! نواب صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ مولوی صہبائیؔ صاحب، مفتی صدر الدین صاحب اور نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہؔ کو بھی اپنے ہمراہ لائیے گا تو عنایت ہوگی۔ حکیم صاحب کہنے لگے: میاں صہبائیؔ سے تو میں ابھی کہے دیتا ہوں۔ اب رہے آزردہؔ اور شیفتہؔ تو واپس جاتے جاتے ان سے بھی کہتے جاؤ۔ یہ کہہ دینا کہ میں نے تم کو بھیجا ہے۔ ہاں تاریخ کیا مقرر کی ہے؟ مشاعرہ کہاں ہوگا اور ''طرح'' کیا ہے؟ میں نے تاریخ بتا کر مکان کا پتا دیا۔ ''طرح'' کے متعلق حضرت جہاں پناہ کے حضور میں جو گفتگو ہوئی تھی، وہ بیان کی۔ کہنے لگے: ہمارے بادشاہ سلامت بھی عجیب چیز ہیں۔ جو سوجھتی ہے نئی سوجھتی ہے۔ شاید ایسا مشاعرہ کہیں بھی نہ ہوا ہوگا، جس میں ''طرح'' نہ دی گئی ہو۔ خیر یہ تو اچھا ہوا کہ جھگڑے کا جھونپڑا ہی نہیں رہا۔ مگر بھئی بات یہ ہے کہ جب تک مقابلے کی صورت نہ ہو، نہ شعر کہنے میں جی لگتا ہے نہ پڑھنے میں لطف آتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ کپڑے دیکھنے میں مشغول ہو گئے اور میں سلام کر کے رخصت ہوا۔

معنی اور اشارے:

گول چندوے	ٹوپی کے اوپر کا گول حصہ
ازراہ ذرہ نوازی	دوستی کے طور پر، پیار کے طریق سے
بعید	دور
چراغ پا ہونا	خفا ہونا
اثقال	ثقل کی جمع، بوجھ، وزن
چمپئی	سونے یا چمپا کی سی رنگت
زیب	خوبصورتی
مطبع	چھاپا خانہ، پریس
طرح	مشاعرے میں غزل کہنے کے لیے جو مصرع دیا جاتا ہے
تہذیبی	معاشرتی لحاظ سے
تسلط	قبضہ

معروضی سوالات:

1۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین کتنے جلدوں میں شائع ہوئے ہیں؟

(i) سات (ii) پانچ

(iii) چار (iv) تین

2۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین کس نام سے شائع ہوئے ہیں؟

(i) مضامین فرحت (ii) فرحت کے مضامین

(iii) افادہ (iv) نئے رنگ خیال

3۔ غالبؔ دلّی کے کس محلے میں رہتے تھے؟

(i) بلّی ماران (ii) مہرولی

(iii) چاندنی چوک (iv) لال قلعہ

4۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کا پہلا مضمون کس رسالے میں شائع ہوا؟

(i) افادہ (ii) مضامین فرحت

(iii) ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی (iv) ان میں سے کوئی نہیں

مختصر ترین سوالات:

1۔ استاد ذوقؔ کی خدمت میں کون حاضر ہوا۔

2۔ امین الدین خان صاحب کس کے بھائی تھے؟

مختصر سوالات:

1۔ مرزا غالبؔ نے کسے مشاعرے میں چلنے کو پوچھا؟

2۔ مولوی کریم الدین صاحب کے استاد کا کیا نام تھا؟

3۔ حکیم مومن خاں مومنؔ کے کپڑے کس قسم کے ہوتے تھے؟

4۔ نواب زین العابدین خاں عارفؔ کی آخری خواہش کیا تھی؟

تفصیلی سوالات:

1۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے حالات زندگی پر مختصر نوٹ لکھیے۔

2۔ مرزا فرحت اللہ بیگ اس سبق کی معرفت کیا کہنا چاہتے ہیں؟ تفصیل سے بیان کیجیے۔

3۔ مرزا غالبؔ، ذوقؔ اور مومن خاں مومنؔ کے مکان کا آنکھوں دیکھا حال مولوی کریم الدین نے کس طرح تحریر کیا ہے؟ بیان کیجیے۔

4۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے اس سبق میں غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ میں سے کسی ایک حصہ کا خلاصہ اپنی زبان میں لکھیے۔

(9)

قاضی عبدالغفار

[پیدائش 1889ء، وفات 1956ء]

قاضی عبدالغفار کی پیدائش دسمبر 1889ء میں مرادآباد صوبہ اتر پردیش میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ 1905ء میں ہائی اسکول پاس کیا۔ پھر وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ چلے گئے۔ قاضی عبدالغفار نے بحیثیت صحافی کئی اخبارات اور رسائل میں کام کیا۔ 1934ء میں حیدرآباد گئے، وہاں سے اخبار 'قیام' جاری کیا۔ وہ حیدرآباد کے محکمۂ اطلاعات کے ناظم بھی مقرر ہوئے۔ 1947ء میں انجمن ترقی اردو کے سکریٹری ہوئے۔ قاضی عبدالغفار کو صحافت اور تخلیقی ادب سے یکساں دلچسپی تھی۔ انھوں نے بہت اہم تخلیقی کارنامے انجام دیے ہیں۔ ''لیلیٰ کے خطوط'' اور ''مجنوں کی ڈائری''

ان کے دو اہم ناول ہیں۔ قاضی عبدالغفار نے ناول کو نئے طرز یعنی خطوط کے انداز کو اردو ادب میں مقبول کیا۔ ''تین پیسے کی چھوکری'' ان کا افسانوی مجموعہ ہے، جس میں بارہ افسانے اور دو انشائیے ہیں۔ 'پندار کا صنم کدہ' ان کا اہم ڈرامہ ہے۔ اس میں انھوں نے اس وقت کے معاشرے کی عکاسی کی ہے اور ذات پات اور سماجی ناہمواریوں کو پیش کیا ہے۔ قاضی عبدالغفار نے اپنے سفرنامہ یورپ کو ''نقش فرنگ'' کے نام سے لکھا، جو دارالاشاعت پنجاب لاہور سے 1924ء میں شائع ہوا۔ قاضی عبدالغفار نے 22/مئی 1922 سے 11/جنوری 1923 کے درمیان یورپ کا سفر کیا۔ عبدالغفار خلافت کمیٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے دوسری وفد میں لندن گئے تھے۔ اس سفر میں ان کے ساتھ حکیم اجمل خاں، ہز ہائنس آغا خاں، مشیر حسین قدوائی، مختار احمد انصاری کا ساتھ رہا۔ لندن میں مسٹر مانٹیگو، مسٹر لائیڈ جارج وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔ یہ سفرنامہ پورے سفر کی اہم معلومات فراہم کرتا ہے۔ اس دوران انھوں نے ایک ہفتہ کا قیام فرانس میں کیا تھا۔ انھوں نے سفرنامے کے اس حصّے ''عروس البلاد'' میں فرانس کی فضا کے حسن کو بڑے سلیس انداز میں پیش کیا ہے۔ اس سفرنامے میں ان کی شوخی اور ظرافت نمایاں ہے لیکن ان کی زبان کی سلاست اور شگفتہ انداز بیان سفر کے حالات کو مزید دلکش بناتے ہیں۔ اس ہمہ جہت شخصیت کو اردو ادب نے 17/جنوری 1956ء کو کھو دیا۔ ان کی تدفین علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں ہوئی۔

عروس البلاد

انگلستان آتے ہوئے ہم نے انگلش چینل میں موسم اچھا پایا تھا حالاں کہ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ ساحل فرانس سے ساحل انگلستان تک آنے میں سمندر کے تلاطم سے دوچار ہونا نہ پڑے۔ گو یہ سفر ایک دو گھنٹہ سے زیادہ کا نہیں۔ لیکن اسٹیمر چھوٹے اور ہلکے ہوتے ہیں۔ علاوہ بریں سمندر ہمیشہ کم وبیش متلاطم رہتا ہے۔ اسٹیمر بہت زیادہ جھکولے کھاتا ہے اور مسافروں کی طبیعت بدمزہ ہو جاتی ہے۔ گو میں کسی سمندر کے سفر میں جہاز کی حرکت اور پانی کے تلاطم سے بدمزہ نہیں ہوتا۔ نہ کبھی متلی ہوتی ہے نہ قے آتی ہے۔ مگر واپسی کے وقت انگلستان کے ساحل سے فرانس کے ساحل تک پہنچنا دوبھر ہو گیا۔ سمندر کی موجیں اسٹیمر کے بالائی عرشہ تک آتی تھیں اور اسٹیمر کا یہ حال تھا کہ بری طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔ دوپہر کا کھانا حلق سے اتارنا مشکل ہو گیا۔ رکابیاں میز پر ٹھہرنے سے قطعاً انکار کرتی تھیں اور میں نے تو سمندر کا ایک طمانچہ ایسا کھایا کہ عمر بھر یاد رہے گا۔ ہم اپنے چھوٹے بیگ اور کمبل وغیرہ اوپر عرشہ پر چھوڑ آئے تھے۔ میں کھانا کھانے کے بعد اس خیال سے اوپر گیا کہ اپنا چھوٹا بیگ اٹھا لاؤں اور ذرا سمندر کے تلاطم کا لطف بھی دیکھوں۔ مگر عرشہ پر پہلا ہی قدم رکھا تھا کہ ایک موج زور سے آ کر ٹکرائی، میں وہیں گر گیا اور اگر دو چار قدم اور آگے بڑھا ہوتا تو تعجب نہ تھا کہ وہ موج مجھے کھینچ کر سمندر میں لے جاتی۔ اس صورت میں دنیا کی آبادی تو کچھ کم نہ ہوتی مگر یہ اوراق شروع سے آخر تک سادہ رہ جاتے۔ بہر حال جہاز کے ملازمین نے سنبھالا، سارے کپڑے شرابور ہو گئے اور اس چڑیا کی طرح جس کو کنویں سے نکالا گیا ہو ہم آتش دان کے پاس سوکھنے لگے! و لے بخیر گذشت۔ شام کو ۷ بجے پیرس کے اسٹیشن پر پہنچے، جہاں اپنے دوست موسیو والدام کو موجود پایا، سیدھے ہوٹل گئے اور ترک احباب کو اپنے وہاں پہنچنے کی اطلاعیں دیں۔

ہم نے اپنے پروگرام میں ایک ہفتہ پیرس کے لیے رکھا تھا۔ پیرس میں ایک ہفتہ اس طرح گزرا کہ گزرتا ہوا معلوم بھی نہ ہوا۔ لندن کے بعد یہ ۳۰ لاکھ کی آبادی اور اسی کی نسبت سے شہر کی عمارتیں اور بازاروں کی چہل پہل ہمارے

لیے کوئی بڑی عجیب بات نہ تھی۔ تاہم برطانوی دارالسلطنت کی تاریکی اور سردی سے نکل کر پیرس کی آب وہوا بے حد خوش گوار معلوم ہوئی۔ یا لندن کی سر بفلک عمارتیں ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی شاہ راہ پر چلنے والوں کو چاروں طرف سے گھیر کر کچل دیں گی یا پیرس کے خوب صورت بازار اور محلے ہیں کہ وہ اتنے کشادہ نہ بھی ہوں، مگر صاف اور ستھرے ہیں۔ اس ''جنت نگاہ'' میں برطانوی اور فرانسیسی قوموں کا فرق صاف نظر آتا تھا۔ نہ صرف عمارتیں اور شہر کی دلچسپیاں بلکہ فرانسیسی اخلاق بھی ایک بالکل دوسری چیز ہے۔ مجھے تو یہ محسوس ہوا کہ اگر یورپ میں کوئی قوم ہے جو بہ لحاظ فطری مذاق کے ایشیا سے کچھ ربط رکھ سکتی ہے تو وہ فرانسیسی قوم ہے۔ تصنع نہیں ہے معائب اور محاسن دونوں صاف نظر آتے ہیں عیبوں پر اس غرض سے ملمع نہیں کیا جاتا کہ وہ ہنر معلوم ہوں۔ سچائی اور خوش اخلاقی بے لاگ ہے اور اسی طرح گناہ بھی عریاں ہے۔ ہر عیب وصواب سب بے پردہ ہے۔ برا کہیے یا اچھا، شاید یورپ کی تمام دوسری اقوام اس خصوصیت سے محروم ہیں۔

شام کو بلوارد پر چہل قدمی کیجیے یا تولیریز کا نظارہ دیکھیے یا شب کو کسی اوپرا میں یا فائز میں جائیے، وہی بے تکلفی اور رسم وراہ کی آزادی نظر آئے گی جو معصیت سے تو پاک نہیں مگر مکر سے پاک ہے۔ مومارٹ (جو بجائے خود ایک محلّہ ہے) میں تھوڑا وقت گزاریئے تو انسانیت کے عجیب عجیب نمونے نظر آئیں یہ مقام رسم ورواج کی آزادیوں کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہے۔ ایک ایشیا نژاد جب سورج کی روشنی میں مردوں اور عورتوں کی بے تکلفیوں کو سرراہ دیکھتا ہے تو ایک سرسری نظر کے بعد اس کا دل اس سے پوچھتا ہے کہ اگر بداخلاقیاں اور عیش پرستیاں قوموں کی تباہی کا بڑا سبب ہوتی ہیں تو پھر یورپ کیوں زندہ ہے؟ پیرس میں دو ہی قسم کے لوگ زندہ رہ سکتے ہیں یا تو وہ جوان چیزوں کے عیب وصواب پر غور کرنے کی حدود سے آگے نکل گئے ہوں یا وہ جو فلسفیانہ نظر سے ان تماشوں کو دیکھ سکیں۔ تھیئٹروں اور ناچ گھروں میں جانے کی زحمت کیوں گوارا کیجیے، شب کو سرراہ رقص کی محفلیں جمی ہوتی ہیں۔ ایک دو نہیں سارے شہر میں سیکڑوں۔ ان میں رقاصہ کا ہلکا ریشم کا لباس بھی اس کے جسم صندلیں سے بغاوت کرتا ہے اور پھر گویا ملک کا کوئی قانون نہیں جو حوّا کی ان بیٹیوں پر عائد ہو سکے۔ لباس کا ہر تکمہ وہ سوئی کے ٹانکوں، سے جھگڑا کرتا ہے، موزوں کی باریکی اور جسم کی رنگت میں تمیز کرنا ممکن نہیں۔ لباس کی تیاری میں اگر کفایت شعاری یوں ہی بڑھتی رہی تو عجب نہیں کہ یورپ کی صنف نازک پھر ایک دفعہ فطرت کے

اس لباس سے آراستہ نظر آئے ''جس کا نہیں سیدھا الٹا''۔

آج تک ہندوستان میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ترکوں کی بداخلاقی کو ان کی تباہی کا باعث بتاتے ہیں شاید سچ ہو۔ مگر کسی فرانسیسی کے سامنے ایسا نہ کہیئے گا۔ مفلس ہندوستانیوں کے طبائع کیوں کر ان گرم بازاریوں سے مانوس ہوسکیں۔ میرا تو یہ حال تھا کہ تخیل دو چیزوں میں الجھا ہوا تھا۔ دن میں شہر کے اکثر مقامات دیکھتا تھا، جہاں گذشتہ جنگ کے خوفناک نقش ونگار ابھی تک موجود ہیں، گولوں کے گرنے کے شان ٹوٹی ہوئی عمارتیں گری ہوئی دیواریں میرا رہنما ہر چیز کو ٹھہر ٹھہر کر دکھاتا تھا۔ یہ کب ہوا، کیسے ہوا۔ جب جرمنوں کا گولہ گرا تو اس محلّہ کا کیا حال تھا؟ کتنے آدمی مارے گئے تھے۔ کتنے زخمی ہوئے تھے۔ غرض ساری تفصیل بتاتا تھا۔ مگر شام کو بازاروں میں اور لب سڑک رقص وسرور کے ہنگامے کچھ ایسے ہوتے تھے کہ گویا اس شہر پر کبھی کوئی مصیبت ہی نہ آئی تھی۔ ہر شخص کا ایک قدم (کم ازکم) بالکل بہشت کی چوکھٹ پر اور دوسرا قدم دنیا میں! یہ عالم میرے لیے ایک معمّہ تھا! انسان کس قدر مصیبتوں کو بھولتا ہے۔ اور ہمارے ایشیا میں جس چیز کو عبرت کہتے ہیں، وہ کیا ہے۔ کچھ ہے یا محض ڈھکوسلا ہے! اس ہنگامۂ عیش میں سارا پیرس اور فرانس کی شہری آبادی غرق ہے۔

گو کہ فرانسیسی قوم کا شمار جنگ جو اقوام میں نہیں ہے، تاہم قومی شجاعت کے نشانات ہم کو ہر جگہ نظر آئے۔ نپولین کا نام تو پیرس کے در و دیوار پر موجود ہے۔ کہیں کوئی کتبہ لگا ہوا ہے، کہیں نپولین کے نام کا فوّارہ نصب ہے۔ کہیں بڑے بڑے مینار اور دروازے بنائے گئے ہیں، جن پر نپولین کی فتوحات کے مختلف مرقعے نقش ہیں، خود نپولین کا بنایا ہوا مینار واندَم کالم اپنی قسم کی ایک ہی چیز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نپولین نے بارہ سو توپوں کو جو وہ دشمن سے چھین کر لایا تھا گلایا اور اس کے لوہے سے یہ ۱۴۲ فٹ اونچا مینار بنایا گیا۔ جس کے اوپر خود نپولین کا ایک مجسمہ نصب ہے۔ ایک فوارہ ''فاؤنٹین دی لا دکتور'' بھی فرانسیسی صناعی اور اس سے زیادہ فرانسیسی تخیل کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ اس کو نپولین اول نے اپنی فتوحات کی یادگار کے طور پر بنایا تھا۔ فوارے کی وضع یہ ہے کہ چار مجسموں پر فوارہ کا طشت رکھا ہوا ہے۔ ہر مجسمہ حکومت کی ایک خاص صفت کا مظہر ہے۔ ایک وفاداری کی تصویر ہے دوسرا باخبری کا مرقع ہے۔ تیسرا انصاف کا بت ہے۔ چوتھا طاقت کا دیوتا ہے۔ ان سب سے اوپر ''فتح'' کا ایک انسانی تخیل مجسمہ کی صورت میں نصب ہے. 1914ء کے بعد اب اگر تہذیب جدید

کی یادگار قائم کرنی ہوتو اس فوارہ کو پانچ مجسموں کی ضرورت نہیں۔صرف دو کافی ہیں۔ نیچے طاقت کا دیوتا اور اوپر فتح کا ایک پیالہ،جس سے خون کا فوارہ چل رہا ہو۔

پیرس کے نواح میں وارسائی ایک مشہور مقام ہے جس کی گذشتہ تاریخ نے مجھے بھی دعوت نظارہ دی۔ پیرس سے وہاں تک موٹر میں گیا۔ بلحاظ قدرتی خوب صورتی شادابی اور سبزہ کے میں نے سویزرلینڈ کے سوا اور کہیں اس قدر خوب صورت سڑک نہیں دیکھی۔میلوں تک یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک سرسبز باغ ہے جو پھولوں سے لدا ہوا ہے۔وارسائی کی تاریخی عظمت کا سب سے بڑا سبب (میری نظر میں) یہ ہے کہ اسی کے رقبہ میں سب سے پہلے انقلاب فرانس کا شعلہ بلند ہوا تھا اور وہ تلواریں سب سے پہلے وہیں بے نیام ہوئی تھیں جنھوں نے استبداد کے زہریلے درخت کو سرزمین فرانس سے کاٹ کر پھینک دیا۔اس وقت سب سے زیادہ قابل دید شاہی محل سمجھا جاتا ہے جس کو انقلاب کے بعد کوئی ایسا مکیں میسر نہ آیا جس کے سر پر تاج ہوتا۔اور اب تو سوائے ایک دو بوڑھے دربانوں کے جو آنے جانے والوں کو عمارت کی سیر کرا دیتے ہیں اور اس بہانے سے ان کی روٹیاں چلتی ہیں اس شاہی محل کے در و دیوار خاموش ہیں جس کی تعمیر و آرائش میں 15 کروڑ روپیہ صرف ہوا تھا۔ایک قبرستان ہے جس کی ایک ایک اینٹ میں فرانسیسی تاج داروں کی بلند اقبالی دفن ہے۔

محل کے اکثر کمرے اسی حالت میں رکھے گئے ہیں، جو حالت کہ شاہ لوئی چہارم کے زمانے میں تھی۔اس عہد کا مورخ کہتا ہے کہ وارسائی کا محل حسن و رعنائی کا ایک نگارخانہ تھا اور آج بھی بہت سے ایسے نقوش وہاں نظر آتے ہیں۔ تصویریں، قالین Tapestary اور بہت سی ایسی چیزیں اپنے گزرے ہوئے مالکوں کی قدردانی کی یادگار موجود ہیں۔ عمارت کے ایک حصے میں تقریباً تمام شاہان فرانس کی تصاویر آویزاں ہیں۔لوہے اور پتھر کے مجسموں سے سارا پائیں باغ پُر ہے۔دس دس قدم پر فرانسیسی مجسمہ ساز کی صنعت کے بہترین نمونے نصب ہیں۔یونان و روما کے تمام دیوتاؤں کے مجسمے صناعوں کی تخیل کے بہترین نمونے، بلا مبالغہ تعداد میں اتنے ہی ہیں جتنے کہ اس باغ میں درخت ہیں۔ وہ سب مصور کی صنعت اور انسانی حسن کا ایک ویران خانہ ہے جس کی در و دیوار نے شاہان فرانس کی عیش پرستیوں کے کیسے کیسے ہنگامے دیکھے ہوں گے۔ہم ہندوستان میں ایک جان عالم واجد علی شاہ اور محمد شاہ پیا کی بزم آرائیوں پر انگلیاں اٹھاتے ہیں۔ وہاں

کتنے ہی جان عالم اور پیا گزر گئے ہیں اور آج ہر شخص بجائے خود ''جان عالم'' اور ''پیا'' ہے۔ شاید فرانس کی سیاسی آزادیوں کا یہ بھی ایک اقتضا تھا کہ جب بادشاہوں کی استبدادیت کا قلع قمع کیا گیا تو ان کے حقوق شاہانہ جس میں تعیش بھی شامل ہے ان سے چھین کر عامۃ الناس کے اندر بدرجہ مساوی تقسیم کر دیئے گئے تاکہ اس جمہوریت میں ہر شخص بادشاہ ہو۔

جب 1870ء میں جرمنی اور فرانس کی لڑائی ہوئی تھی اور جرمن فوج نے پیرس کا محاصرہ کر لیا تھا، تو اسی محل میں جرمن شاہ زادے اور افسر مقیم تھے، یہ واقعہ بھی عبرت آموز ہے کہ تیس برس پہلے جس محل میں جرمن افسروں نے فاتح کی حیثیت سے قیام کیا تھا، اسی محل میں گذشتہ جنگ یورپ کے بعد 1919ء میں جرمنوں نے مغلوب و پسپا ہو کر صلح نامہ پر دستخط کیئے! اور وہ میز بھی دیکھی جس پر صلح نامہ رکھا گیا تھا اور وہ قلم بھی موجود ہے جس سے دول کے نمائندوں نے دستخط کیئے تھے۔ وہی ایک محل ہے جس میں فاتح بھی آئے اور مفتوح بھی جو کل غالب تھا آج مغلوب ہو کر آیا۔ اور معلوم نہیں کل پھر کیا ہونا ہے۔ اینٹ اور پتھر کی یہ دیواریں کیا کیا تماشا دیکھتی ہیں!

معنی اور اشارے:

بالائی	اوپری
دارالسلطنت	راجدھانی
تصنع	بناوٹ
تکمہ	گھنڈی، بٹن
طبائع	طبیعت کی جمع
تخیل	خیال
فتوحات	فتح کی جمع
رقبہ	گھری ہوئی زمین، احاطہ
استبداد	ظلم و جور سے حکومت کرنا
بزم	محفل، مجلس
مساوی	برابر، یکساں
مقیم	قیام پذیر

معروضی سوالات:

1۔ قاضی عبدالغفار کب پیدا ہوئے؟

(i) 1880 (ii) 1882

(iii) 1885 (iv) 1889

2۔ قاضی عبدالغفار کس کمیٹی کے وفد کے ساتھ لندن گئے؟

(i) خلافت کمیٹی (ii) گول میز کانفرنس

(iii) خدائی مددگار کمیٹی (iv) سپّرِ کمیٹی

3۔ ناول لیلیٰ کے خطوط کس کی تخلیق ہے؟

(i) قاضی عبدالغفار (ii) سجاد حیدر

(iii) نذر سجاد حیدر (iv) خواجہ احمد عباس

4۔ قاضی عبدالغفار کی تخلیق نقش فرنگ کی صنف کیا ہے؟

(i) سفرنامہ (ii) ناول

(iii) داستان (iv) سوانح

5۔ قاضی عبدالغفار کی وفات کب ہوئی؟

(i) 1956 (ii) 1958

(iii) 1960 (iv) 1962

مختصر ترین سوالات:

1۔ قاضی عبدالغفار کہاں پیدا ہوئے؟

2۔ قاضی عبدالغفار نے کون سا اخبار جاری کیا؟

مختصر سوالات:

1۔ سفرنامہ ''نقش فرنگ'' میں کس سفر کی روداد ہے؟

2۔ سفرنامہ ''نقش فرنگ'' میں کن اہم شخصیات کا ذکر ہے؟

3۔ سفرنامہ تصنیف کرنے والے دو ادیبوں کے نام لکھیے۔

تفصیلی سوالات:

1۔ قاضی عبدالغفار نے سفرنامہ کے ساتھ کن اصناف میں طبع آزمائی کی؟

2۔ سبق ''عروس البلاد'' کا خلاصہ اپنی زبان میں لکھیے۔

3۔ قاضی عبدالغفار کے حالاتِ زندگی و ادبی خدمات پر مختصر نوٹ لکھیے۔

(10)

رشید احمد صدیقی

[پیدائش 1894ء، وفات 1977ء]

رشید احمد صدیقی اتر پردیش کے ضلع جونپور کے مڑیاہو قصبہ میں 1894ء میں پیدا ہوئے۔ وہیں کے اسکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے 1915ء میں علی گڑھ گئے۔ 1921ء میں ان کا تقرر اردو لکچرار کی حیثیت سے ہوا۔ جب علی گڑھ یونیورسٹی بنی تو رشید احمد صدیقی شعبۂ اردو کے صدر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1957ء تک شعبۂ اردو کے صدر رہے۔ کئی سال تک علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر رہے۔ مختلف مزاحیہ مضامین خود بھی لکھتے رہے۔ اس کے بعد مرکزی وزارت تعلیمات کی ایک اسکیم کے ڈائرکٹر ہو گئے۔ جس کے تحت آپ نے جنرل ایجوکیشن کی کتابوں کی تیاری کی

ذمہ داری اٹھائی۔ 1963ء میں ان کی ادبی خدمات کے عوض حکومت ہندوستان نے انھیں پدم شری کا اعزاز عطا فرمایا۔ ان کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ رشید احمد صدیقی 1977ء میں اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے اور علی گڑھ میں ہی تدفین ہوئی۔

فکر کی گہرائی اسلوب کی دلکشی و تجربے کی وسعت نے رشید احمد کو وہ بلند مقام عطا کیا ہے جو کم فنکاروں کو نصیب ہوتا ہے۔ ان کے قلم کے اصل جو ہر طنز وظرافت میں نظر آتے ہیں۔ ان کے مضامین میں طنز ومزاح کی آمیزش شیر وشکر جیسی ہے۔ رشید احمد صدیقی نے اپنے مضامین میں طنز ومزاح کے جو اعلیٰ نمونے پیش کیے ان کا نمایاں وصف فکر آمیزی ہے۔ ان کی ہنسی فرحت بخش ہونے کے ساتھ ساتھ فکر انگیز بھی ہے۔ انوکھا پن، تازگی، بانکپن اور ادبی حُسن اُن کی تحریر کی امتیازی خصوصیات ہیں۔

رشید احمد صدیقی اردو ادب کے بہترین خاکہ نگار بھی ہیں۔ انھوں نے اپنے خاکہ میں شخصیت کے عادات و خصائل کا تذکرہ منفرد انداز میں کیا ہے۔ اُن کے خاکے مختصر ہوتے ہیں۔ ''گنج ہائے گراں مایہ'' ان کے خاکوں کا مجموعہ ہے۔ وہ جب کسی شخصیت کا خاکہ کھینچتے ہیں تو مکمل سچّائی سے کام لیتے ہیں۔ ان کا فن ان کی ایمانداری کا عکاس ہے۔ انھوں نے دو قسم کی شخصیات کے خاکے کھینچے ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق علی گڑھ سے ہے۔ دوسرا وہ گروہ ہے جو ہندوستان بھر میں مشہور ومقبول ہے۔ ان کے نوشتہ خاکے ان افراد کی زندگی کو سمجھنے کے لیے بہت اہم ہیں کیوں کہ ان میں حالات زندگی، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا سب نظر آتا ہے۔ جگر صاحب، ان کی خاکہ نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔

ان کے مضامین میں جو اسلوب ابھر کر سامنے آیا اس میں معنویت وسعت رنگینی، تصویر کشی، جمالیاتی خط اور ادبی وقار وتمکنت بہ درجۂ اتم موجود ہے۔ یہی نہیں، ان کی تصانیف میں سیاسی، سماجی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی مسائل کو دلچسپ انداز میں پیش کرنے کی وجہ سے ایک علمی وادبی شان پائی جاتی ہے۔

ان کی اہم تصانیف میں مضامین رشید، خنداں، گنج ہائے گراں مایہ، ہم نفسانِ رفتہ، جدید غزل، غزل کی وکالت اور آشفتہ بیانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

جگر صاحب

بالکل یاد نہیں آتا جگر صاحب سے پہلے پہل کب کہاں اور کیسے ملاقات ہوئی ممکن ہو الہ آباد میں ہوئی ہو جہاں اصغؔر صاحب مرحوم ہندوستانی اکیڈمی یو۔ پی میں صیغہ اردو کے مشیر ادبی تھے۔ کسی کام سے الہ آباد جانا ہوتا تو میرا قیام اصغؔر صاحب کے یہاں ہوتا۔ یہ زمانہ اور اس کے بعد کا کافی زمانہ ایسا تھا جب جگؔر صاحب پر شراب کا بڑا تسلط تھا۔ رفتہ رفتہ مجھ سے اتنی رسم و راہ ہوگئی کہ جگر صاحب جب کبھی علی گڑھ تشریف لاتے تو میرے ہاں ٹھہرتے، یہاں تک کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے بڑے عزیز اور محترم دوست بن گئے۔

الہ آباد میں اصغؔر صاحب کے سامنے جگؔر صاحب اس طرح خاموش، مودب اور آنکھیں نیچی کئے ہوئے بیٹھتے کہ ان سے گفتگو بھی کی جاتی تو صرف ہاں 'نہیں' میں مشکل سے جواب دیتے اور پھر سر جھکا لیتے۔ اصغر صاحب - مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے ان کے ہاں پہنچ جاتا تو وہ ایسے خوش ہوتے جیسے ان کا رواں مسکرانے لگا ہو۔ ان کے اس طرح خوش ہونے سے مجھ پر آسودگی اور عفو کی ایسی کیفیت طاری ہوتی جیسے میں ان تمام لوگوں کا قصور معاف کرنے لگا ہوں جنھوں نے میرے ساتھ ظلم و زیادتی کی تھی۔ کبھی کبھی وہیں جگر صاحب مل جاتے۔ ان کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ خود نہ آئے ہوں بلکہ کسی نے پہنچا دیا ہو اور اس کے منتظر ہوں کہ موقع ملے تو پھر اپنی مہم پر چلے جائیں۔ ان کے مواجہہ میں اصغؔر صاحب مجھ سے تفصیل سے گفتگو نہ کرتے۔ میں بھی کوئی ذکر نہ چھیڑتا۔ ہم دونوں بیٹھے ہوتے تو جگر صاحب اُٹھ کر چلے جاتے۔ اصغؔر صاحب، جگر صاحب کو زیادہ خاموش یا اکتایا ہوا دیکھتے تو کبھی کبھی مسکرا کر یہ فقرہ ان کو سنا دیتے ''چاہے جہاں پھرو'' لوٹ کر نہیں آنا پڑے گا، اس کے بعد جب مجھ سے مخاطب ہو کر ہنسنا بولنا شروع کر دیتے۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا ''اصغر صاحب کہاں آنا پڑے گا؟'' بیچارے آ تو جاتے ہیں۔'' اصغر صاحب میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔ ان کی آنکھیں ان سے زیادہ مسکراتی تھیں۔ پھر بولے ''ابھی کہاں آئے ہیں'' ابھی تو لائے جاتے ہیں۔'' ایک دفعہ الہ آباد پہنچا تو اصغر صاحب کے

ہاں جگرؔ صاحب نے شرکت سے معذوری کا اظہار کیا۔ اصغر صاحب اس دن کچھ بدحظ سے معلوم ہوتے تھے۔ چلتے چلتے کھڑے ہوگئے اور جگرؔ صاحب کو مخاطب کرکے بولے۔ ''یہ سب تمھارے شعر نہیں سنتے تمھارا گوشت کھاتے ہیں! اصغر صاحب کی آزردگی پر کسی قدر برہمی کا رنگ چھانے لگا تھا۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کھانے کے کمرہ میں داخل ہوا۔ اصغر صاحب کھانے کی طرف متوجہ ہوئے تو میں نے کہا۔ ''اصغر صاحب آپ تو لکھنوی شاعری کے تشبیہ استعاروں کے کبھی شیدائی نہ تھے۔ یہ گوشت کا کیا قصہ ہے؟ کھانے سے ہاتھ روک لیا۔ کچھ خشمگیں لیکن زیادہ حزیں لہجہ میں بولے رشید صاحب آپ کو کیا معلوم یہاں ایسے بے رحم لوگ بھی ہیں جوان کو جہاں چاہتے ہیں پکڑ لیتے ہیں اور یہ جو اسپرٹ ہوتی ہے نا، وہ پلا پلا کر ان سے شعر سنتے ہیں اور جب یہ ادھ موئے ہو جاتے ہیں تو یکے پر لاد پھاند کر یہاں پہنچا دیتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ اصغر صاحب بے کیف ہوگئے ہیں اور کھانے سے بھی ہاتھ کھینچ لیا ہے۔

جس نے پوچھا ''اصغر صاحب آپ نماز تو پڑھتے ہیں؟'' بولے ''ہاں'' میں نے کہا۔ ''....صاحب تو آپ کو صاحب کشف و کرامات بھی بتاتے ہیں۔'' بولے ''جی تو پھر؟'' میں نے عرض کیا ''....صاحب نے آپ کا ایک شعر سُن کر آپ کو مستجاب الدعوات قرار دیا تھا۔'' بولے آپ بھی تو کچھ کہئے'' میں نے کہا '' آپ اللہ سے دعا کیوں نہیں مانگتے کہ جگرؔ صاحب کا گوشت کھانے والے وِجیٹیرین ہو جائیں'' اصغر صاحب ہنس پڑے اور ہم دونوں کھانے میں مصروف ہوگئے! کھانا کھلانے پر جو ملازم مامور تھا اس سے پوچھتے جاتے تھے یہ کھانا یا وہ کھانا جگر صاحب کے لیے رکھ دیا ہے یا نہیں اس سے اطمینان نہیں ہوتا تھا تو ڈونگے اور پلیٹ سے نکال کر علیحدہ پلیٹوں میں رکھتے جاتے اور کہتے ''یہ سب جگر صاحب کے لیے ہے۔ بغیر کھانا کھلائے ان کو باہر نہ جانے دینا؟''

میرے گھر کا ہر چھوٹا بڑا جگر صاحب کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ یونیورسٹی اور شہر میں بھی جگر صاحب محبوب و مقبول تھے۔ اس زمانے میں بھی شراب کا بڑا زور تھا۔ اکثر غافل اور بدمست شہر سے لائے جاتے۔ یونیورسٹی کے اندر کوئی نہ کوئی طالب علم مل جاتا جو ان کو میرے ہاں لاتا۔ میں گھر پر نہ موجود ہوتا تو وہ کمرے میں پہنچا کر دیکھ بھال میں مصروف ہو جاتا۔

یہ طالب علم جگر صاحب کی نرسنگ اس طور پر کرتے جیسے کوئی اپنے باپ یا بھائی کی خدمت کر رہا ہو، یا کوئی نرس

سرسام میں مبتلا مریض کی نرسنگ کرتی ہو۔اور یہ اس زمانے کی بات ہے جب جگر صاحب اور یہ طالب علم دونوں اپنی اپنی جگہ پر ان بانکوں سے کم نہ تھے جن کے قصے تاریخوں اور داستانوں میں ہم پڑھتے آئے ہیں۔ میں آجاتا تو طالب علم چلے جاتے اور معلوم نہیں کیوں اور کیسے جگر صاحب خاموش اور مودب ہو جاتے۔لیکن ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا جیسے رہ رہ کر سمندر کی تہہ میں کوئی طاقتور موج ابل کر باہر آنے والی ہو لیکن سطح کے قریب پہنچ کر یک بیک زور ختم کر کے واپس چلی جاتی ہو۔ یہ باتیں میں اس لیے نہیں بیان کر رہا ہوں کہ اس میں میری بڑائی نکلتی ہے۔ میری یہ نیت ہوتی تو میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ اس بھونڈے طریقہ سے اس کی نمائش کرتا۔ جگر صاحب سے مجھے یہی تو شکایت ہے کہ وہ میرے سامنے مؤدب کیوں ہو جاتے ہیں۔ مجھے ایسے آدمی سے ملنے میں بڑی الجھن ہوتی ہے جو مجھے ہر وقت ''گارڈ آف آنر'' دیتا رہے اور اس سے بھی کچھ کم کوفت اس وقت نہیں ہوتی جب کوئی شخص میرے سامنے مجھ سے زیادہ مسخرا بننے کی کوشش کرتا ہے۔

جگر صاحب اپنے حلقے کے لوگوں میں بیٹھے ہوتے ہیں تو بہت خوش اور بے تکلف ہوتے ہیں۔ ایسے میں جگر صاحب کے پاس جانے سے پرہیز کرتا ہوں۔ لیکن اتفاق یا ضرورت سے پہنچ جاؤں تو وہ اس طرح خاموش اور سنجیدہ ہو جائیں گے جیسے مکتب کے چھوٹے بچے ہنس بول یا اودھم مچا رہے ہوں اور دفعتاً مولوی صاحب نمودار ہو جائیں۔

جگر صاحب یقیناً مجھ سے بہتر انسان ہیں۔ وہ مجھ سے مساوات برتیں، میری عیادت کریں، مجھ سے خدمت لیں، مجھ سے جھگڑیں یا مذاق کریں، یہ ساری باتیں سمجھ میں آتی ہیں لیکن وہ مجھے حرمین شریفین قسم کا مولوی یا کسی اردو اخبار کا آبرو باختہ اڈیٹر یا برطانوی عہد کا تھانیدار سمجھیں، یہ میرے لیے ڈوب مرنے کی بات تو ہے ہی خود جگر صاحب کے لیے کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کے ہاں میرا جو رکھ رکھاؤ ہے وہ غالباً اس تعلق سے ہے جو مجھے اصغؔر صاحب سے یا اصغر صاحب کو مجھ سے تھا۔ اس طرح کی باتوں کا جگر صاحب بڑا لحاظ کرتے ہیں۔ وضعداری شریفوں کی پرانی کمزوری ہے!

ایک دفعہ خبر آئی کہ جگر صاحب شراب سے تائب ہو گئے، یقین نہ آیا کہ ایسا ہوا ہوگا۔ سمجھتا تھا کہ آج نہیں کل یہ خبر آئے گی کہ پھر سے شروع کر دی۔ بری عادتیں اس آسانی سے نہیں چھوٹتیں جس آسانی سے اچھی عادتیں چھوٹ جاتی ہیں۔ سوچتا یہ تھا کہ جب میں اپنی معمولی بری عادتیں چھوڑ دینے پر قادر نہیں ہوں تو جگر صاحب شراب کیسے چھوڑ دیں گے جس

میں وہ اس طرح ڈوبے ہوئے تھے جس طرح شاید جوش گریہ میں غالب کا دل ڈوبی ہوئی اسامی تھا۔

جگر صاحب شراب سے کیوں اور کیسے تائب ہوئے اس کا مجھے علم نہیں۔ اس بارہ میں ان سے کبھی ذکر نہ آیا۔ اتنا البتہ جانتا ہوں ان پر شراب کا کتنا ہی غلبہ کیوں نہ ہوتا ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہوتی جسے مبتذل کہہ سکیں۔ ان کی زبان سے خفیف کلمات نہیں نکلتے تھے۔ وہ کبھی لوٹتے پوٹتے ڈند مچاتے نہیں پائے گئے۔ مجھے تو اکثر محسوس ہوا جیسے کیف وسرخوشی بخشنے کے بجائے شراب ان کو انتہائی دردوکرب میں مبتلا کردیتی ہو۔ ان پر تھوڑی شراب بھی بہت اثر کرتی تھی۔

ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ ان کے اعصاب بڑے ذکی الحس ہیں اور تھوڑی سی تحریک بھی بہت ہو جاتی ہو۔ شاعری میں بھی ان کا یہی حال ہے۔ جیسے خیال یا جذبہ برقی رو بن کر ان کے جسم وجان کو جھن جھنا دیتا ہو۔ کچھ دنوں سے ان کے کلام میں یہ بات بظاہر کم ہوگئی ہے لیکن غور کرنے پر محسوس ہوتا ہے کہ جو بات کہی گئی ہے اس میں تاثرات کی شدت ہے لیکن ان کو پیش کیا گیا ہے زیادہ مدھم آواز اور انداز میں۔

جگر صاحب کی شاعری میں ایک بات یادرکھنے کی ہے کہ اصلاً وہ دوری اور مہجوری کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کی رفتار اور سمت کا مطالعہ کیا جائے تو آسانی سے معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ فراق کے شاعر ہیں وصال کے نہیں۔ ان کا محبوب سے رشتہ کا انداز (Centrifugal) (مرکز گریز) ہے۔ یہی سبب ہے کہ جگر صاحب کی شاعری میں محبوب کی عفّت میں کہیں کوئی خلل نظر نہیں آتا اور ان کا کلام اس آلودگی اور بے راہ روی سے پاک ہے جو ہماری شاعری اور سوسائٹی میں آج کل نظر آتی ہے. میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ جو شاعر ذہن وفکر کے اعتبار سے محبوب سے قریب سے قریب اور جسم وجان کے اعتبار سے دور سے دور ہؤ وہ اس شاعر سے بالعموم بہتر اور برتر ہوگا جس کی پوزیشن اس کے بالکل برعکس ہو۔ جگر کے نقاد کو یہ نکتہ مدنظر رکھنا چاہئے۔

شراب چھوڑنے کے بعد جگر صاحب طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہو گئے۔ یہ زمانہ ان پر بڑا سخت گزرا صحت خراب ہوگئی طرح طرح کی ذمہ داریوں نے آگھیرا، مالی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی۔ جگر صاحب نے پامردی سے ان مصیبتوں کو جھیلا، وہ جگر صاحب کا رزمیہ ہے۔ کتنے اور کیسے کیسے ''روز ابروشب ماہتاب'' آئے ہونگے اور جگر صاحب پر سے گزر

گئے ہونگے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جگر صاحب بڑے مذہبی آدمی ہیں۔ مذہبی لوگوں کے بارے میں میرا تجربہ کچھ اچھا نہیں ہے۔ میں نے اکثر ایسے لوگوں کو مذہب میں مبتلا پایا جن میں خاصی اخلاقی کمزوریاں تھیں۔ یہ لوگ خدا کو اس منطق سے قائل کرتے ہیں۔ ''میں جتنی شادیاں کرتا اور طلاق دیتا ہوں اتنی ہی زائد رکعتیں نماز کی بھی تو پڑھ لیتا ہوں۔'' وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح امریکہ ہر چیز کی قیمت ڈالر میں وصول کرتا ہے اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کا کفارہ نفلوں میں قبول کر لیتا ہے۔

مذہب بڑی سخت اور بڑی قابل قدر آزمائش ہے۔ بالخصوص مسلمانوں کا مذہب۔ جس طرح کی مذہبی لوگ میرے پیش نظر ہیں، وہ اس درجہ بے وقوف ہوتے ہیں کہ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جب وہ اپنے اردگرد کے معمولی سوجھ بوجھ کے لوگوں کو دھوکا نہیں دے سکتے تو وہ خدا کو کیونکر دھوکا دینگے جس کی صفات کا ان کو علم ہے۔ یقین ہو یا نہ ہو۔ ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ خدا نے اپنے سارے اختیارات ان بندوں کو ہمیشہ کے لیے منتقل کردیے ہیں جن کا وہ حق مارتے رہتے ہیں۔ ایسے معاملات میں وہ خدا کے ہاں جتنی عرضیاں بھیجتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو پڑھے بغیر عدالت مجاز کو واپس کر دیتا ہے۔

ان میں بعض ایسے معصوم بھی ملیں گے جو اس کوشش میں رہتے ہیں کہ خدا کو نہ سہی ان فرشتوں ہی کو دھوکا دے کر کاربراری کرلیں جو ان کا اعمال نامہ مرتب کرنے کے لیے کاندھوں پر بٹھا دیئے گئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آخرت میں پٹواری کے اندراجات کی بنا پر مقدمہ جیت لیں گے!

جگر صاحب ان معنوں میں مذہبی آدمی ہیں کہ وہ اللہ رسول اور انسان کے حقوق پہنچانتے ہیں اور اس کا لحاظ رکھتے ہیں کہ جس کا جو حق ہو، اسے پہنچ جائے۔ وہ نفع کے ضرر اور ضرر کے نفع کو جانتے ہیں۔ ان میں حیا ہے، وہ پرائی چیز کو اپنانے کے درپے نہیں ہوتے ان میں غیرت اور حمیت ہے۔ ظلم اور زیادتی اپنے پر ہو تو جھیل جائیں گے دوسرے پر ہو تو اس کی حمایت میں اپنے کو خطرہ میں ڈال دیں گے۔ ان کے یہ جوہر تقسیم ملک کی ہلاکتوں میں کھلے! تفصیل میں طوالت ہے۔

جگر صاحب عالم فاضل نہیں ہیں۔ مذہب ہو، سیاست ہو، شعر و ادب ہو، ان کی گفتگو منطقیانہ فلسفیانہ نہ ہوگی۔ ان کا احساس جتنا سریع اور شدید ہے اتنا ان کا مطالعہ وسیع نہیں ہے۔ وہ خود اپنی شاعری کے بارے میں تفصیل سے گفتگو

نہیں کر پاتے وہ اپنی شاعری سے باہر نکل کر کسی اور کی شاعری پر غور کرنا نہیں چاہتے۔ شاید غور کر بھی نہیں سکتے۔ جس کے جذبات تند و تیز ہوں وہ غور کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

جگر صاحب میں مروت اور وضع داری بہت ہے۔ جس سے رسم و راہ ہو جائے اس کے لیے وہ تمام آداب برتتے ہیں جو شریفوں میں قدیم سے چلے آتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے بڑے دھوکے کھائے اور نقصان اٹھائے۔ تکریم اور تواضع میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے کپڑے اچھے پہنتے ہیں، سامان قیمتی رکھتے ہیں، جس کو ہمیشہ کوئی نہ کوئی مانگ لیتا ہے یا چرا لیتا ہے، ورنہ کہیں کھو آتے ہیں! جگر صاحب جب کبھی میرے ہاں آئے میں نے یہ سوال کیا ''جگر صاحب سفر میں کیا کھو آئے''؟ اور تقریباً ہمیشہ یہی معلوم ہوا کہ کچھ نہ کچھ کہیں نہ کہیں چھوڑ آئے جگر صاحب جس کے مہمان ہوتے ہیں اس پر بہت کچھ اپنا ہی صرف کر دیتے ہیں۔ میں نے غصہ میں ان کو آپے سے باہر ہوتے نہیں دیکھا۔ حکم چلاتے نہ پایا۔ اپنی بڑائی کبھی ان کی زبان پر نہ آئی، دوسروں کے عیب انھوں نے کبھی نہیں ڈھونڈھے اور نہ ان کی تشہیر کی۔ ایسے لوگ کم ہیں جو اپنی بڑائی جتانے کے لیے ایسا نہ کرتے ہوں۔ جگر صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ عام شعراء کی مانند اس تاک میں نہیں رہتے کہ کوئی غریب اور شریف مل جائے تو اپنے اشعار سنا سنا کر اسے اَدھ موا کر دیں۔

جگر صاحب کو معصوم بچوں سے کھیلتے ہوئے کم لوگوں نے دیکھا ہوگا۔ بالخصوص ایسے حال میں کہ جگر صاحب کو نہ معلوم ہو کہ انھیں کوئی دیکھ رہا ہے۔ بچے سے کہیں زیادہ معصوم وہ خود نظر آتے ہیں۔ جگر صاحب کا چہرہ بشرا ایسا نہیں ہے کہ کوئی بچہ ان کے سامنے بے تکلف ہو سکے۔ اس کی کمی جگر صاحب طرح طرح سے پوری کرتے ہیں وہ اپنے آپ کو بچے کا کھلونا بنا دیتے ہیں، ایسا کھلونا جس کو بچہ نہ کھیلے تو کھلونا خود کھیلنے لگے۔

میں نے بعض مشہور، مستند اور عمر رسیدہ شعراء کو دیکھا ہے جو دوسرے شاعر کی برائی بیان کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مشاعرے میں شاعر اپنا کلام سنا رہا ہے اور بیٹھے اس پر بازاری فقرہ چست کر رہے ہیں اور آس پاس کے نالائقوں سے اپنی اس خفیف الحرکتی کی داد لیتے جا رہے ہیں۔ اس طرح کی بے ہودگی کسی اور میں ہو تو ہو شاعر میں ہرگز نہ ہونا چاہئے۔ اس طرح کی حرکت شاعر نہیں کرتے بلکہ وہ لوگ بھی کرتے ہیں جو شعر و ادب کے پارکھ سمجھے جاتے ہیں اور جنھوں نے عمر کا

بیشتر حصہ شعر و ادب کی خدمت میں گزارا ہے۔ بس یہ گوارا نہیں کہ ان کے ہوتے دوسرا کیوں؟

بعض شعراء، بعض اشعار اور بعض مواقع ضرور ایسے ہوتے ہیں جب پھبتی فقرہ زبان پر ضرور آ جاتا ہے۔ اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی، یہ فقرہ اور پھبتی وہ مزا دے جاتے ہیں جو اچھے اچھے اشعار نہیں دے پاتے۔ لیکن اس طرح کے فقرے اور پھبتی کہنے کا حق مشاعرے میں سامعین کو حاصل ہے خود شعرا کو نہیں مشاعروں میں اب یہ بات عام ہوگئی ہے۔ بالخصوص دہلی کے پبلک مشاعروں میں۔ آج کل شاید ہی کوئی تقریب ایسی ہوتی ہو جہاں بے ہودگی اور آبروریزی کے ایسے مناظر دیکھے جاتے ہوں جیسے دہلی کے اس طرح کے مشاعروں میں مجھے تو کبھی کبھی اس کا اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ شاید وہ دن بھی دور نہیں جب دہلی کا کوئی من چلا سرمایہ دار شاعروں کی کوئی سرکس کمپنی بنالے اور امریکن فری اسٹائل میں ان کے کرتب اور کرتوت شہر شہر دکھاتا پھرے۔

خلوت ہو یا جلوت جگرؔ صاحب کو میں نے ساتھی شعرا کے کلام پر کبھی حاشیہ آرائی کرتے نہیں پایا۔ مشاعرے میں ان کی طرح سنجیدہ اور خاموش بیٹھنے والا شاید ہی کوئی اور ہو۔ ان کی زبان سے کوئی فقرہ اگر نکلے گا بھی تو تحسین اور ہمت افزائی کا۔ یہاں مجھے ثاقبؔ اور صفیؔ مرحومین بے اختیار یاد آتے ہیں۔ لکھنؤ کے یہ باکمال شعرا مشاعرے میں جس ادب اور احترام سے بیٹھتے اور مناسب مواقع پر تحسین کے کلمات جس شریفانہ انداز سے کہتے وہ اب کہیں نہیں نظر آتا۔

جگرؔ صاحب میرے یہاں تشریف لاتے ہیں تو چند باتوں کا میں خاص طور پر خیال رکھتا ہوں۔

اول یہ کہ جگرؔ صاحب کی صحت اچھی نہ ہوگی اس لیے اپنے عزیز ڈاکٹروں کو بلواتا ہوں جو ان کا مکمل معائنہ کرتے ہیں۔ وہ دوا اور غذا تجویز کریں گے، پرہیز بتائیں گے اور دوسرے مشورے دیں گے میں ان سب پر جگرؔ صاحب سے عمل کراؤں گا۔

دوسرے یہ کہ جگرؔ صاحب معلوم نہیں کہاں کہاں اور کتنے دنوں کا چکر لگاتے ہوئے آتے ہیں۔ ان کے ساتھ میلے کپڑے، چادر، غلاف، تولیہ کا انبار ہوتا ہے۔ دھوبی بلوا کر یہ کپڑے اس کے حوالہ کروں گا۔

تیسرے یہ کہ جگرؔ صاحب کا خط بڑھا ہوگا۔ اس کے لیے نائی بلاؤں گا تاکہ وہ جگرؔ صاحب کو نوک پلک سے

درست کردے۔

چوتھے یہ کہ اس بات کا انتظام کروں گا کہ جگر صاحب کے عشاق ان کو علی گڑھ میں گھسیٹتے نہ پھریں اور میرے یہاں نہ اپنا کلام ان کو سنائیں اور نہ ان کا کلام خود سنیں۔

پانچویں یہ کہ جگر صاحب کے پاس جو نقدی ہوتی ہے اسے ضبط کر لیتا ہوں تاکہ وہ علی گڑھ میں روپیہ اس طرح خرچ نہ کریں جس طرح بعض حکومتیں دوسری حکومتوں پر خرچ کرتی ہیں۔

چھٹے یہ کہ جگر صاحب رخصت ہونے لگتے ہیں تو میں خدا حافظ کہنے کے لیے نہیں موجود ہوتا اس لیے کہ جگر صاحب کچھ اس گداز قلب کے ساتھ رخصت ہوتے ہیں جیسے نہ ان کو میری زندگی کا بھروسا ہے نہ اپنی زندگی کا۔ اور اس طرح سے رخصت ہونا یا رخصت کرنا میرے بس کی بات نہیں۔

معنی واشارے:

مشیرادبی	ادبی مشورہ دینے والا
قیام	ٹھہرنا
تسلط	غلبہ
مودب	ادب کے ساتھ
غافل	بے پروا
مقبول	پسندیدہ یا قبول کیا ہوا
گارڈ آف آنر	حکومت کی طرف سے مسلح فوج کا سلوٹ
حرمین شریفین	مکہ معظّمہ ومدینہ منورہ
غلبہ	اثر، برتری
مبتذل	ذلیل وحقیر
ذکی الحس	سمجھداری
مہجوری	جدائی
فراق	جدائی، ہجر
عفت	عصمت یا پارسائی
عکس	پرتو، پرچھائیں
نقاد	تنقید کرنے والا
سریع وشدید	تیز اثر

متحمل	صبر و برداشت کرنے والا، مستقل مزاج
وضع داری	سلیقہ یا اپنے طور طریقوں پر قائم رہنا
دقیقہ	معمولی بات
مستند	تصدیق کیا ہوا
خفیف	ہلکا، کم ظرف
آبرو ریزی	بے عزتی، ذلت
خلوت	تنہائی کی جگہ
جلوت	عام جگہ یا سب کے سامنے
تحسین	تعریف
گداز قلب	نرم دل

معروضی سوالات:

1۔ رشید احمد صدیقی کو کس صنف میں شہرت حاصل ہے؟

(i) تنقیدی مضامین (ii) غزل گوئی

(iii) طنز و ظرافت (iv) تاریخ نویسی

2۔ مضمون 'جگر صاحب' کا تعلق کس صنف سے ہے؟

(i) خاکہ (ii) خود نوشت سوانح حیات

(iii) مزاحیہ مضمون (iv) نشری تقریروں کا مجموعہ میں سے ایک۔

3۔ رشید احمد صدیقی کس یونیورسٹی میں بحیثیت صدر شعبہ اردو فائز تھے؟

(i) الہ آباد یونیورسٹی (ii) بنارس ہندو یونیورسٹی

(iii) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (iv) لکھنؤ یونیورسٹی

مختصر ترین سوالات:

1۔ رشید احمد صدیقی کی پیدائش کہاں ہوئی؟

2۔ حکومتِ ہند نے رشید احمد صدیقی کو کس اعزاز سے نوازا؟

مختصر سوالات:

1۔ رشید احمد صدیقی کے دو مزاحیہ مضامین کے نام لکھیے۔

2۔ رشید احمد صدیقی کے خاکوں کے مجموعے کے نام لکھیں۔

تفصیلی سوالات:

1۔ رشید احمد صدیقی کے حالاتِ زندگی پر مختصر نوٹ لکھیے۔

2۔ رشید احمد صدیقی کی خاکہ نگاری پر اپنی رائے دیجیے۔

3۔ رشید احمد صدیقی کے طنزیہ مزاحیہ مضامین پر روشنی ڈالیے۔

4۔ جگر صاحب کے شخصیت کی دو اہم خوبیاں لکھیں۔

(11)

پطرس بخاری

[پیدائش 1898ء، وفات 1958ء]

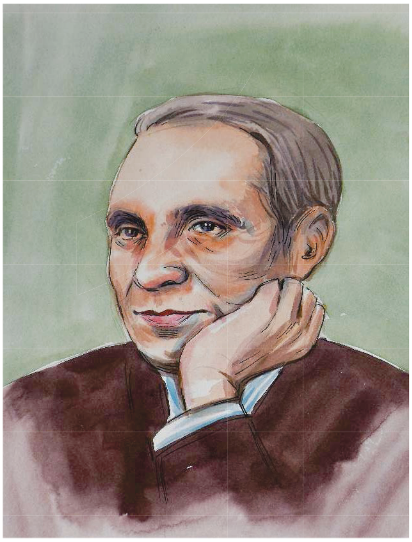

پطرس بخاری کا اصل نام احمد شاہ بخاری تھا۔ 1898ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ یہ بچپن ہی سے بہت ذہین تھے۔ ابتدائی تعلیم پشاور میں پائی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے، وہاں کیمبرج یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ واپس آنے پر دلّی میں آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل ہو گئے اور اس منصب پر 1947 تک فائز رہے۔ 1947ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1950ء میں ترقی کرتے کرتے اقوام متحدہ (UNO) میں پاکستان کے نمائندہ کی حیثیت سے ڈپٹی سکریٹری جنرل بن گئے اور نیویارک میں رہنے لگے۔ ملازمت کے خاتمے پر لاہور واپس آ کر ادب کی خدمات کرنا چاہتے تھے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ 5 دسمبر 1958ء کو امریکہ میں دل کا دورہ

پڑنے سے انتقال کر گئے۔

پطرس کی تصانیف کی تعداد زیادہ نہیں ہے لیکن انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ انھیں صفِ اول کے ادیبوں میں جگہ دلانے کو کافی ہے۔ان کے مضامین کا ایک مجموعہ 'مضامین پطرس' کے نام سے شائع ہوا ہے جس میں کل گیارہ مضامین ہیں۔ان کا شمار ان لکھنے والوں میں ہوتا ہے جنھوں نے کم لکھا لیکن شہرت زیادہ حاصل کی۔

پطرس نے اردو مزاح نگاری کو ایک نئے راستے پر لگانے کی کوشش کی ہے۔ یہ سیدھی سادی باتوں میں مزاح پیدا کرتے ہیں۔اکثر اپنے آپ کو بھی مزاح کا موضوع بنانے سے نہیں چوکتے۔

واقعات کا تسلسل اور کردار کی حرکات وسکنات فطری طور پر اس طرح دکھاتے ہیں کہ اپنے آپ مزاح کا پہلو نکل آتا ہے۔ یہ ان کی ذہانت ہی ہے کہ اپنی تراکیب سے معمولی سے معمولی خیال کو بھی بلند کر دیتے ہیں۔

ان کا اندازِ بیان ایسا پر لطف ہے کہ پڑھنے والا بے ساختہ ہنسنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ان کی تصانیف حقیقت نگاری پر مبنی ہیں۔اُن کی زبان سادہ، رواں اور دلکش ہے۔شگفتگیِ بیان ایسی کہ معمولی سے معمولی بات بھی پُر اثر ہو جائے۔ پطرس نے اپنے انشائیہ سنیما کا عشق میں مرزا صاحب کی بے پروائی اور اس پر مصنف کے جذباتی تاثرات کا نقشہ بے حد دلچسپ انداز میں کھینچا ہے۔

سنیما کا عشق

''سنیما کا عشق''، عنوان تو عجب ہوس خیز ہے لیکن افسوس کہ اس مضمون سے آپ کی تمام توقعات مجروح ہوں گی کیونکہ مجھے تو اس مضمون میں کچھ دل کے داغ دکھانے مقصود ہیں۔

اس سے آپ یہ نہ سمجھئے کہ مجھے فلموں سے دلچسپی نہیں یا سنیما کی موسیقی اور تاریکی میں جو رومان انگیزی ہے، میں اس کا قائل نہیں۔ میں تو سنیما کے معاملے میں اوائل عمر ہی سے بزرگوں کا موردِ عتاب رہ چکا ہوں۔ لیکن آج کل ہمارے دوست مرزا صاحب کی مہربانیوں کے طفیل سنیما گویا میری ایک دکھتی ہوئی رگ بن کر رہ گیا ہے۔ جہاں اس کا نام سن پاتا ہوں، بعض دردانگیز واقعات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جس سے رفتہ رفتہ میری فطرت ہی کج بیں بن گئی ہے۔

اوّل تو خدا کے فضل سے ہم سنیما کبھی وقت پر نہیں پہنچ سکے۔ اس میں میری سستی کو ذرا دخل نہیں۔ یہ سب قصور ہمارے دوست مرزا صاحب کا ہے جو کہنے کو تو ہمارے دوست ہیں لیکن خدا شاہد ہے، ان کی دوستی سے جو جو نقصان ہمیں پہونچے ہیں کسی دشمن کے قبضۂ قدرت سے بھی باہر ہوں گے۔

جب سنیما جانے کا ارادہ ہو ہفتہ بھر پہلے سے انھیں کہہ رکھتا ہوں کہ کیوں بھئی مرزا اگلی جمعرات سنیما چلو گے نا؟ میری مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ پہلے سے تیار رہیں اور اپنی تمام مصروفیتیں کچھ اس ڈھب سے ترتیب دے لیں کہ جمعرات کے دن ان کے کام میں کوئی ہرج واقع نہ ہو لیکن وہ جواب میں عجب قدر ناشناسی سے فرماتے ہیں۔

''ارے بھئی چلیں گے کیوں نہیں؟ کیا ہم انسان نہیں؟ ہمیں تفریح کی ضرورت نہیں ہوتی؟ اور پھر کبھی ہم نے تم سے آج تک ایسی بے مروتی بھی برتی ہے کہ تم نے چلنے کو کہا ہو اور ہم نے تمھارا ساتھ نہ دیا ہو؟''

ان کی تقریر سن کر میں کھسیانا سا ہو جاتا ہوں۔ کچھ دیر چپ رہتا ہوں اور پھر دبی زبان سے کہتا ہوں۔

''بھئی اب کے ہو سکا تو وقت پر پہونچیں گے، ٹھیک ہے نا؟''

میری یہ بات عام طور پر ٹال دی جاتی ہے کیونکہ اس سے ان کا ضمیر کچھ تھوڑا سا بیدار ہو جاتا ہے۔ خیر میں بھی بہت زور نہیں دیتا۔ صرف ان کو سمجھانے کے لیے اتنا کہہ دیتا ہوں۔

''کیوں بھئی! سنیما آج کل چھ بجے شروع ہوتا ہے نا''؟

مرزا صاحب عجب معصومیت کے انداز میں جواب دیتے ہیں، ''بھئی یہ ہمیں معلوم نہیں''۔

''میرا خیال ہے چھ ہی بجے شروع ہوتا ہے''

''اب تمھارے خیال کی تو کوئی سند نہیں''

''نہیں مجھے یقین ہے۔ چھے بجے شروع ہوتا ہے''

''تمھیں یقین ہے تو میرا دماغ کیوں مفت میں چاٹ رہے ہو؟''

اس کے بعد آپ ہی کہیے میں کیا بولوں؟

خیر جناب جمعرات کے دن چار بجے ہی ان کے مکان کو روانہ ہو جاتا ہوں۔ اس خیال سے کہ جلدی جلدی انھیں تیار کرا کے وقت پر پہنچ جائیں۔ دولت خانے پر پہنچتا ہوں تو آدم نہ آدم زاد۔ مردانے کے سب کمروں میں گھوم جاتا ہوں۔ ہر کھڑکی میں سے جھانکتا ہوں، ہر شگاف میں سے آوازیں دیتا ہوں لیکن کہیں سے رسید نہیں ملتی۔ آخر تنگ آ کر ان کے کمرے میں بیٹھ جاتا ہوں۔ وہاں دس پندرہ منٹ سیٹیاں بجاتا رہتا ہوں۔ دس پندرہ منٹ تک پنسل سے بلاٹنگ پیپر پر تصویریں بناتا رہتا ہوں۔ پھر سگریٹ سلگا لیتا ہوں اور باہر ڈیوڑھی میں نکل کر ادھر ادھر جھانکتا ہوں۔ وہاں بدستور ہو کا عالم دیکھ کر کمرے میں واپس آ جاتا ہوں اور اخبار پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ ہر کالم کے بعد مرزا صاحب کو ایک آواز دے لیتا ہوں، اس امید پر کہ شاید ساتھ کے کمرے میں یا عین اوپر کے کمرے میں تشریف لے آئے ہوں؟ سو رہے تھے تو ممکن ہے جاگ اٹھے ہوں؟ یا نہا رہے تھے تو شاید غسل خانے سے باہر نکل آئے ہوں؟ لیکن میری آواز مکان کی وسعتوں میں سے گونج کر واپس آ جاتی ہے آخر کار ساڑھے پانچ بجے کے قریب زنانے سے تشریف لاتے ہیں۔ میں اپنے کھولتے ہوئے خون کو قابو میں لا کر متانت اور اخلاق کو بڑی مشکل سے مدِّ نظر رکھ کر پوچھتا ہوں۔

”کیوں حضرت آپ اندر ہی تھے؟“

”ہاں اندر ہی تھا“

”میری آواز آپ نے نہیں سنی؟“

”اچھا یہ تم تھے؟ میں سمجھا کوئی اور ہے“

آنکھیں بند کر کے سر کو پیچھے ڈال لیتا ہوں اور دانت پیس کر غصے کو پی جاتا ہوں اور پھر کانپتے ہوئے ہونٹوں سے پوچھتا ہوں۔ ”تو اچھا آپ چلیں گے یا نہیں“؟

”وہ کہاں؟“

”ارے بندۂ خدا، آج سنیما نہیں جانا؟“

”ہاں سنیما۔ سنیما (یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں) ٹھیک ہے سنیما۔ میں بھی سوچ رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ایسی ہے جو مجھے یاد نہیں آ رہی ہے۔ اچھا ہوا تم نے یاد دلا دیا ورنہ مجھے رات بھر الجھن رہتی۔“

”تو چلو پھر اب چلیں؟“

”ہاں وہ تو چلیں گے ہی۔ میں سوچ رہا تھا آج ذرا کپڑے بدل لیتے، خدا جانے دھوبی کمبخت کپڑے بھی لایا ہے یا نہیں۔ یاران دھوبیوں کا تو کوئی انتظام کرو۔“

اگر قتل انسانی ایک سنگین جرم نہ ہوتا تو ایسے موقع پر مجھ سے ضرور سرزد ہو جاتا۔ لیکن کیا کروں اپنی جوانی پر رحم کھاتا ہوں۔ بے بس ہوتا ہوں۔ صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ

”مرزا بھئی لِلّٰہ مجھ پر رحم کرو۔ میں سنیما چلنے کو آیا ہوں۔ دھوبیوں کا انتظام کرنے نہیں آیا۔ یار بڑے بدتمیز ہو۔ پونے چھے بج چکے ہیں اور تم جوں کے توں بیٹھے ہو“۔

مرزا صاحب عجب مربیانہ تبسّم کے ساتھ کرسی پر سے اٹھتے ہیں، گویا یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اچھا بھئی تمھاری طفلانہ خواہشات آخر ہم پوری کر ہی دیں۔ چنانچہ پھر یہ کہہ کر اندر تشریف لے جاتے ہیں کہ اچھا کپڑے پہن آؤں۔

مرزا صاحب کے کپڑے پہننے کا عمل اس قدر طویل ہے کہ اگر میرا اختیار ہوتا تو قانون کی رو سے انھیں کبھی کپڑے اتارنے ہی نہ دیتا۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ کپڑے پہنے ہوئے تشریف لاتے ہیں۔ ایک پان منھ میں دوسرا ہاتھ میں۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ دروازے تک پہنچ کر مڑ کے جو دیکھتا ہوں تو مرزا صاحب غائب۔ پھر اندر آجاتا ہوں۔ مرزا صاحب کسی کونے میں کھڑے کچھ کرید رہے ہوتے ہیں۔

''ارے بھئی چلو''

''چل تو رہا ہوں یار، آخر اتنی بھی کیا آفت ہے۔''

''اور یہ تم کر کیا رہے ہو؟''

''پان کے لیے ذرا تمبا کو لے رہا تھا۔''

تمام راستے مرزا صاحب چہل قدمی فرماتے جاتے ہیں۔ میں ہر دو تین لمحے کے بعد اپنے آپ کو ان سے چار پانچ قدم آگے پاتا ہوں کچھ دیر ٹھہر جاتا ہوں۔ وہ ساتھ آملتے ہیں تو پھر چلنا شروع کر دیتا ہوں۔ پھر آگے نکل جاتا ہوں، پھر ٹھہر جاتا ہوں۔ غرضیکہ گو چلتا دگنی تگنی رفتار سے ہوں لیکن پہنچتا ان کے ساتھ ہی ہوں۔

ٹکٹ لے کر اندر داخل ہوتے ہیں تو اندھیرا گھُپ۔ بہتیرا آنکھیں جھپکتا ہوں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ ادھر سے کوئی آواز دیتا ہے ''یہ دروازہ بند کر دو جی''۔ یا اللہ اب جاؤں کہاں؟ رستہ، کرسی، دیوار، آدمی کچھ بھی تو نظر نہیں آتا۔ ایک قدم بڑھاتا ہوں تو سر ان بالٹیوں سے جا ٹکراتا ہے جو آگ بجھانے کے لیے دیوار پر لٹکی رہتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد تاریکی میں کچھ دھندلے سے نقش دکھائی دینے لگتے ہیں۔ جہاں ذرا تاریک تر دھبّہ دکھائی دے جائے۔ وہاں سمجھتا ہوں خالی کرسی ہوگی۔ خمیدہ پشت ہو کر اس کا رخ کرتا ہوں اس کے پاؤں کو پھاند، اس کے ٹخنوں کو ٹھکرا، خواتین کے گھٹنوں سے دامن بچا کر، آخر کار کسی کی گود میں جا بیٹھتا ہوں۔ وہاں سے نکال دیا جاتا ہوں اور لوگوں کے دھکّوں کی مدد سے کسی خالی کرسی تک جا پہنچتا ہوں۔ مرزا صاحب سے کہتا ہوں ''میں نہ بکتا تھا کہ جلدی چلو''۔

خوامخواہ میں ہم کو رسوا کروایا نا! گدھا کہیں کا'' اس شگفتہ بیانی کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ساتھ کی کرسی پر جو حضرت

بیٹھے ہیں اور جن کو میں مخاطب کر رہا ہوں وہ مرزا نہیں کوئی اور بزرگ ہیں۔

اب تماشے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ فلم کون سی ہے؟ اس کی کہانی کیا ہے؟ اور کہاں تک پہونچ چکی ہے؟ سمجھ میں صرف اس قدر آتا ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت جو پردے پر بغل گیر نظر آتے ہیں۔ ایک دوسرے کو چاہتے ہوں گے۔ اس انتظار میں رہتا ہوں کہ کچھ لکھا ہوا سامنے آئے تو معاملہ کھلے کہ اتنے دیر میں سامنے کی کرسی پر بیٹھے ہوئے حضرت ایک وسیع اور فراخ انگڑائی لیتے ہیں، جس کے دوران میں کم از کم دو تین سوفٹ فلم گذر جاتی ہے۔ جب انگڑائی کو لپیٹ لیتے ہیں تو پھر سر کھجانا شروع کرتے ہیں اور اس عمل کے بعد ہاتھ کو سر سے نہیں ہٹاتے بلکہ بازو کو ویسے ہی خمیدہ رکھے رہتے ہیں۔ میں مجبوراً سر کو نیچا کر کے چائے دانی کے اس دستے کے بیچ میں سے اپنی نظر کے لیے راستہ نکال لیتا ہوں اور اپنے بیٹھنے کے انداز سے بالکل ایسا معلوم ہوتا ہوں کہ جیسے ٹکٹ خریدے بغیر اندر گھس آیا ہوں اور چوروں کی طرح بیٹھا ہوا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد انھیں کرسی کی نشست پر کوئی مچھر یا پسّو محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ دائیں طرف سے ذرا اونچے ہوکر بائیں طرف کو جھک جاتے ہیں۔ میں مصیبت کا مارا دوسری طرف جھک جاتا ہوں۔ ایک دو لمحے کے بعد وہی مچھّر دوسری طرف ہجرت کر جاتا ہے۔ چنانچہ ہم دونوں پھر سے پینترا بدل لیتے ہیں۔ غرضیکہ یہ دل لگی یوں ہی جاری رہتی ہے۔ وہ دائیں تو میں بائیں وہ بائیں تو میں دائیں۔ ان کو کیا معلوم کہ اندھیرے میں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ دل یہی چاہتا ہے کہ اگلے درجے کا ٹکٹ لے کر ان کے آگے جا بیٹھوں اور کہوں کہ لے بیٹا، دیکھوں تو اب تو کیسے فلم دیکھتا ہے۔

پیچھے سے مرزا صاحب کی آواز آتی ہے ''یار تم سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا اب جو ہمیں ساتھ لائے ہو تو فلم تو دیکھنے دو۔''

اس کے بعد غصے میں آ کر آنکھیں بند کر لیتا ہوں اور قتلِ عمد، خودکشی، زہر خورانی وغیرہ معاملات پر غور کرنے لگتا ہوں۔ دل میں کہتا ہوں ایسی کی تیسی اس فلم کی۔ سو سو قسمیں کھاتا ہوں کہ پھر کبھی نہ آؤں گا اور اگر آیا بھی تو اس کمبخت مرزا سے ذکر تک نہ کروں گا۔ پانچ چھ گھنٹے پہلے سے آ جاؤں گا۔

اوپر کے درجے میں سب سے اگلی قطار میں بیٹھوں گا۔ تمام وقت اپنی نشست پر اچھلتا رہوں گا۔ بہت بڑے طرّے والی پگڑی پہن کر آؤں گا اپنے اورکوٹ کو دو چھڑیوں پر پھیلا کر لٹکا دوں گا۔ بہرحال مرزا کے پاس تک نہ پھٹکوں گا۔

لیکن اس کمبخت دل کو کیا کروں؟ اگلے ہفتے پھر کسی اچھے فلم کا اشتہار دیکھ پاتا ہوں تو سب سے پہلے مرزا کے ہاں جاتا ہوں اور گفتگو پھر وہیں سے شروع ہوتی ہے کہ کیوں بھئی مرزا اگلی جمعرات کو سنیما چلوگے نا؟

معنی واشارے:

مجروح	زخمی
موردِ عتاب	غصے کا شکار ہونا
طفیل	ذریعہ، وسیلہ
درد انگیز	دردناک
کج	ٹیڑھا، ترچھا
ناشناسی	ناواقفیت
بیدار	جاگا ہوا
سند	ثبوت، تصدیق نامہ Certificate
شگاف	دراڑ، جھری
رسید	پہنچ، رسائی، کسی چیز کے وصول ہونے کی دستخطی تحریر
وسعت	گنجائش، کشادگی
متانت	سنجیدگی
تاریکی	اندھیرا
خمیدہ پشت	جھکی ہوئی پیٹھ (کمر)
رسوا	بدنام
شگفتہ	کِھلا ہوا، خوش
فراخ	وسیع، کشادہ

معروضی سوالات:

1۔ سنیما کا عشق کے مصنف کون ہیں؟

(i) رشید احمد صدیقی (ii) کنھیا لال کپور

(iii) پطرس بخاری (iv) راجندر سنگھ بیدی

2۔ مصنف نے کس کی وجہ سے سنیما کو ''ایک دُکھتی ہوئی رگ بن گیا ہے'' کہا ہے۔

(i) اپنے دوست کی وجہ سے (ii) مرزا صاحب کی وجہ سے

(iii) مرزا صاحب کے گھر والوں کی وجہ سے (iv) اپنے گھر والوں کی وجہ سے

3۔ مصنف مرزا صاحب سے کس دن سنیما جانے کا وعدہ لیتے ہیں؟

(i) پیر کے دن (ii) منگل کے دن

(iii) بدھ کے دن (iv) جمعرات کے دن

4۔ سنیما کا عشق ذیل میں سے کس طرح کا مضمون ہے۔

(i) سیاسی (ii) سماجی

(iii) مزاحیہ (iv) تنقیدی

5۔ پطرس بخاری کی وفات کب اور کہاں ہوئی

(i) 1958 نیویارک (ii) 1950 دہلی

(iii) 1970 لندن (iv) 1945 لکھنؤ

مختصر ترین سوالات:

1۔ اس مضمون میں مصنف کو مرزا صاحب پر غصّہ کیوں آتا ہے؟

2۔ سنیما جانے کے لیے مصنف مرزا صاحب کے گھر کتنے بجے پہنچ جاتے ہیں؟

مختصر سوالات:

1۔ مرزا صاحب کے کردار پر روشنی ڈالیے۔

2۔ مرزا صاحب پر مصنف کی جھلاّہٹ اور غصے کا کیا اثر ہوتا ہے؟

تفصیلی سوالات:

1۔ پطرس بخاری کی مزاح نگاری پر مضمون لکھیے۔

2۔ پطرس بخاری کے حالات زندگی لکھتے ہوئے ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

(12)

کنھیّالال کپور

[پیدائش 1911ء، وفات 1980ء]

کنھیّالال کپور نومبر 1911ء میں لائل پور پاکستان میں پیدا ہوئے۔ انھیں بچپن سے ہی علم وادب سے گہرا شغف تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد کنھیّالال کپور نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ ان کو وہاں پطرس بخاری جیسا مشفق استاد ملا۔ کنھیالال کپور نے اپنے استاد کی قابلیت اور علمیت سے خوب فیض اٹھایا۔ ان کی شخصیت پر استاد کا گہرا اثر پڑا۔ یہ استاد شاگرد کا رشتہ تا حیات چلا۔ ۵رمئی 1980ء کو مہاراشٹرا کے پونا شہر میں انھوں نے آخری سانس لی۔

کنھیّالال کپور کو بنیادی طور پر طنز و مزاح نگار مانا جاتا ہے لیکن ان کی ہمہ شخصیت پیروڈی نگار، خاکہ نگار، کالم نگار کی ہے۔ انھوں نے اپنے دوستوں، عزیزوں و احباب کو خطوط بھی لکھے۔ ان کو ہم ایک اہم خطوط نگار کی طرح بھی جان سکتے ہیں۔ ان کی اہم تصانیف سنگ وخشت، چنگ ورباب، شیشہ و تیشہ، نوک نشتر، بال و پر، نرم گرم، گردِ کارواں، دلیلِ سحر، نئے شگوفے وغیرہ ہیں۔ ان کے موضوعات عام زندگی کی وہ اشیاء ہیں جن پر لوگ توجہ نہیں دیتے۔ انھوں نے زندگی کے بیشتر پہلوؤں پر طنز کیا ہے۔ ان کے یہاں صرف مزاح کا پہلو نہیں ہے بلکہ ان کا مقصد اصلاح کرنا ہے۔ معمولی چیزوں پر مزے مزے میں لوگوں کی توجہ دلانا ہے۔ کنھیّالال کپور ایک کامیاب خاکہ نگار ہیں۔ وہ خاکہ لکھنے کے لیے جس شخص کو منتخب کرتے ہیں اس سے ایک فاصلہ بنا لیتے ہیں، جس سے جانب داری کے بغیر وہ اس کا اصل خاکہ لکھ سکیں۔ اس طرح وہ اپنا حق ادا کرتے ہیں۔

کنھیّالال کپور کی زبان سادہ، صاف، بے ساختہ اور بانکپن لیے ہوئے ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں برمحل اشعار اور مصرعوں کا جا بجا استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے اسلوب میں دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں پنجابی اور انگریزی کے عام فہم الفاظ کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات کا استعمال ان کے یہاں کم ملتا ہے۔

بے تکلفی

کہنے کو تو استاد ذوقؔ فرما گئے:

ع ''اے ذوقؔ تکلف میں ہے تکلیف سراسر''

لیکن یہ غور نہ فرمایا کہ اگر تکلف میں تکلیف ہے تو بے تکلفی میں کون سی راحت ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ تکلف، وہ تکلف بھی جس کی ''معراج پہلے آپ ہے بے تکلفی سے بدرجہا اچھا ہے۔ فرض کیجئے، آپ جہنم کے دروازے پر کھڑے ہیں اور جہنم کا داروغہ آپ سے کہتا ہے، تشریف لے چلئے'' اور آپ مسکرا کر نہایت لجاجت سے عرض کرتے ہیں اجی پہلے آپ''، تو عین ممکن ہے کہ آپ کے حسن اخلاق سے مرعوب ہو کر آپ کو جہنم کے بجائے جنت میں بھجوا دے۔ اس کے برعکس اگر آپ کی داروغۂ جنت سے بے تکلفی ہے تو ہوسکتا ہے کہ ہنسی مذاق میں وہ آپ کو باغ بہشت کی کسی نہر میں اتنے غوطے دلوائے کہ آپ کو چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔

تکلف کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہینگ لگتی ہے نہ پھٹکری اور ظاہر داری جوں کی توں قائم رہتی ہے۔ مثلاً آپ کے گھر کوئی صاحب تشریف لاتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں، '' کچھ منگواؤں آپ کے لیے'' وہ فرماتے ہیں 'اجی صاحب تکلف مت کیجئے۔''

''چائے پئیں گے۔''

''شکریہ ابھی پی ہے۔''

''سوڈا منگواؤں''

''نہیں صاحب آپ تو خواہ مخواہ تکلف کرتے ہیں۔''

''شربت پیجئے گا۔''

''واہ صاحب۔ آپ تو پھر تکلف پر اتر آئے۔''

''ٹھنڈا پانی پیجیے۔''

''اچھا صاحب۔ اگر آپ اصرار کرتے ہیں تو پی لیں گے۔''

اب اگر انھیں حضرت سے آپ کی بے تکلفی ہو تو آپ کو کتنی زحمت اٹھانی پڑے۔

''کھانا کھائیں گے آپ؟''

''ہاں ہاں ضرور کھائیں گے۔ لیکن کھانا کھانے سے پہلے چائے پئیں گے۔''

''چائے منگواؤں؟''

''ضرور منگوایئے۔ لیکن پہلے سگریٹ پلایئے۔''

''چائے کے ساتھ کیا کھایئے گا؟''

''اماں یار تمھیں معلوم تو ہے۔ پاؤ بھر گاجر کا حلوا، دو آملیٹ، چار ٹوسٹ چھ سنبوسے، دس بارہ کریم رول، اور ہاں ایک آدھ کیک ہو جائے تو سبحان اللہ۔ لیکن جلدی کیجیے۔''

بے تکلفی میں یوں تو ہزاروں قباحتیں ہیں لیکن سب سے بڑی یہ ہے کہ بسا اوقات اس کے طفیل میں آپ کو سخت خفت اٹھانا پڑتی ہے۔ آپ چند معزز اشخاص سے نہایت عالمانہ انداز میں کسی مسئلہ پر گفتگو کر رہے ہیں کہ کوئی صاحب دروازے پر اس طرح دستک دیتے ہیں گویا دروازہ توڑ کر ہی دم لیں گے۔ دو ایک منٹ دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد بلند آواز میں چلانا شروع کر دیتے ہیں۔

''ابے چغد، کہاں ہے تو، دروازہ کھول، ابے نانہجار! سنتا نہیں ہم کب سے چلا رہے ہیں، ارے کوئی ہے سب مر گئے کیا؟''

کمرے میں داخل ہوتے ہیں وہ آپ کے احباب پر نگاہ غلط ڈالتے ہیں اور نہایت متانت سے کہتے ہیں۔

''معاف کیجیے گا صاحب میری ان سے ذرا بے تکلفی ہے۔''

یا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ دو بے تکلف دوستوں کے درمیان کچھ اس طرح گھر جاتے ہیں کہ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ ان میں سے ایک دوسرے کو نہایت غلیظ گالی دیتا ہے اور آپ کی طرف عفو طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہتا ہے ''برا نہ مانئے گا'' دوسرا جواب میں ماں یا بہن کی گالی دیتے ہوئے کہتا ہے ''معاف کیجئے گا۔ ہم بہت دنوں کے بعد ملے ہیں'' اس معذرت کے بعد گالیوں کا وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے کہ آپ کو بے ساختہ اس بے تکلفی کی داد دینی پڑتی ہے۔

ناولوں میں بے تکلف دوستوں کی بڑی دلچسپ مثالیں ملتی ہیں۔ تھیکرے ایک کردار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ صاحب جس دوست کے پاس ٹھہرتے رخصت ہوتے وقت اس سے ایک قمیص ضرور مستعار لیا کرتے تھے۔ ہمارے ایک دوست اس معاملے میں تھیکرے کے اس کردار سے بازی لے گئے ہیں۔ وہ صرف قمیص پر اکتفا نہیں کرتے، ساری پوشاک کا مطالبہ کرتے ہیں، عموماً ٹیکسی میں سوار ہوکر ہمارے ہاں تشریف لاتے ہیں اور کمرے میں داخل ہوتے ہی فرماتے ہیں۔ ''پانچ روپے کا ایک نوٹ نکالئے'' ڈرائیور کو دفع کرلوں۔ پھر باتیں کریں گے۔ یہ حضرت ہمیشہ ہماری عدم موجودگی میں واپسی کا عزم کرتے ہیں اور وداع ہوتے وقت نوکر سے کہہ جاتے ہیں ''وہ آئیں تو انھیں کہہ دیجئے گا کہ میں ان کا گرم کوٹ خاکی ٹائی اور کالی پتلون ساتھ لے جارہا ہوں۔ چند دن استعمال کرکے واپس کردوں گا۔

ہمارے ایک اور بے تکلف دوست ہیں وہ جہاں کہیں ہم سے ملتے ہیں مصافحہ کرنے کے بجائے بار بار بغل گیر ہوکر بے تکلفی کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک بار انارکلی میں ملاقات ہوئی، بازار کے بیچ انھوں نے یہ عمل جو دہرانا شروع کیا تو راہ گیر دانتوں میں انگلیاں داب کر رہ گئے ہر دو منٹ کے بعد بغل گیر ہوکر کہتے۔ ''بھئی خوب ملے، یار حد ہوگئی'' وہ اس انداز سے مجھے اپنے بازوؤں کے شکنجے میں کس رہے تھے گویا برسوں کے بعد ملے ہیں۔ حالانکہ اس ملاقات سے صرف دو دن پہلے مال روڈ پر ملے تھے اور وہاں بھی انھوں نے اسی قسم کی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔

بے تکلف دوست کی تو وہی مثال ہے کہ اسے وبال جان سمجھتے ہوئے بھی آپ وبال جان نہیں کہہ سکتے۔ اگر اس کے جی میں آئے تو آدھی رات آپ کے گھر آدھمکے اور نہ صرف لذیذ کھانے کا مطالبہ کرے بلکہ کہے کہ کھائیں گے بھی یہیں اور سوئیں گے بھی آپ کے ساتھ'' دوپہر کے وقت آپ سو رہے ہوں تو قینچی لے کر ازراہ مذاق آپ کی دونوں

مونچھوں کا صفایا کر ڈالے۔شدت درد سے آپ کراہ رہے ہوں تو بد تمیزی سے آپ کا منہ چڑانا شروع کرے۔آپ مضمون لکھ رہے ہوں تو آپ کے ہاتھ سے مضمون چھین کر آتش دان میں پھینک دے۔

بعض اوقات بے تکلف احباب ایسی حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں کہ آپ بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں ''ہائے تکلف! ہائے تکلف! ایک دفعہ مجھے دہلی جانا تھا، گاڑی کے آنے میں دیر تھی پلیٹ فارم پر ٹہل رہا تھا۔اتنے میں ایک دوست سے ملاقات ہوئی۔ پوچھنے لگے''کہاں جا رہے ہو؟'' میں نے کہا۔''دہلی'' کہنے لگے''دہلی جا کر کیا کرو گے۔چلو ٹاٹانگر چلیں۔ میں نے معذرت چاہی ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں یک لخت انھوں نے کہا۔ذرا ٹکٹ دکھائیے تو میں نے ٹکٹ دکھایا ٹکٹ لے کر انھوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے اور قلی سے کہنے لگے''صاحب کا سامان واپس لے چلو۔انھوں نے دہلی جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔''

انھیں صاحب نے ایک بار اس سے بھی عجیب حرکت کی ایک دن میں دریا کے کنارے کھڑا ہوا غروب آفتاب کا منظر دیکھ رہا تھا، نہ جانے آپ کہاں سے آ ٹپکے، آپ نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ پیچھے سے مجھے اس زور سے دھکا دیا کہ میں لڑکھڑاتا ہوا پانی میں جا گرا۔آپ نہایت ڈھٹائی سے قہقہہ لگا کر فرمانے لگے''واہ خوب چھلانگ لگائی آپ نے'' جب میں بڑی مشکل سے تیر کر کنارے کے قریب پہنچا تو ایک اور قہقہہ لگا کر کہنے لگے کہ مجھے معلوم نہ تھا آپ اتنے اچھے تیراک بھی ہیں۔

تکلف کے خلاف آپ جو چاہیں کہیں۔لیکن آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ تکلف سراسر نفاست ہے اور بے تکلفی سراسر کثافت۔تکلف''پہلے آپ'' ہے تو بے تکلفی''پہلے ہم اور جہنم میں جائیں آپ'' ہے تکلف گز بھر لمبا گھونگھٹ ہے تو بے تکلفی گز بھر لمبی زبان۔تکلف زیر لب مسکراہٹ ہے تو بے تکلفی خندۂ بے باک۔اب اگر اس پر بھی استاد ذوق فرمائیں''کہ تکلف میں سراسر تکلیف ہے۔'' تو ہم تو یہی کہیں گے۔''صاحب آپ کو بے تکلف دوستوں سے پالا ہی نہیں پڑا!''

معنی اور اشارے:

معراج	زینہ، سیڑھی، درجۂ اعلی
راحت	آرام، آسائش، آسودگی
معزز	عزت دار، بزرگ
متانت	سنجیدگی، مضبوطی، پختگی
غلیظ	گندہ
عفوطلب	معافی کا طلب گار
معذرت	معافی مانگنا
مستعار	مانگا ہوا، ادھار لیا ہوا
عزم	ارادہ، نیت
غروبِ آفتاب	سورج کا ڈوبنا

معروضی سوالات:

1۔ کنھّیا لال کپور کہاں پیدا ہوئے؟

(i) لائل پور (ii) کرتار پور

(iii) ننکانہ صاحب (iv) امرتسر

2۔ کنھّیا لال کپور کے استاد کا کیا نام تھا؟

(i) رشید احمد صدیقی (ii) پطرس بخاری

(iii) مشتاق یوسفی (iv) فرحت اللہ بیگ

3۔ کس مزاح نگار نے کامیاب پیروڈی لکھی ہے؟

(i) رشید احمد صدیقی (ii) پطرس بخاری

(iii) مشتاق یوسفی (iv) کنھیا لال کپور

4۔ پطرس بخاری کا خاکہ کس مزاح نگار نے لکھا ہے؟

(i) فرحت اللہ بیگ (ii) رشید احمد صدیقی

(iii) مشتاق احمد یوسفی (iv) کنھیّا لال کپور

مختصر ترین سوالات:

1۔ پطرس بخاری کے شاگرد کا نام بتائیے؟

2۔ کنھیا لال کپور کا انتقال کہاں اور کب ہوا؟

3۔ اردو ادب کے دو مشہور مزاح نگاروں کے نام مع تصنیف لکھیے۔

مختصر سوالات:

1۔ طنز و مزاح سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

2۔ سبق ''بے تکلفی''، کنھیّا لال کپور کی کس کتاب سے منتخب ہے؟

3۔ ''اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر'' اس مصرع کا مطلب بیان کیجیے۔

تفصیلی سوالات:

1۔ سبق 'بے تکلفی' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

2۔ کنھیّالال کپور کی زندگی و ادبی خدمات پر نوٹ لکھیے۔

3۔ درج ذیل اقتباس کی تشریح ضروری حوالوں کے ساتھ کیجیے۔

''بے تکلفی میں یوں تو ہزاروں قباحتیں ہیں لیکن سب سے بڑی یہ ہے کہ بسا اوقات اس کے طفیل میں آپ کو سخت خفت اٹھانا پڑتی ہے۔ آپ چند معزز اشخاص سے نہایت عالمانہ انداز میں کسی مسئلہ پر گفتگو کر رہے ہیں کہ کوئی صاحب دروازے پر اس طرح دستک دیتے ہیں گویا دروازہ توڑ کر ہی دم لیں گے۔''

حصہ شعر و نظم

1- غزل

غزل کے لغوی معنی محبوب سے باتیں کرنا ہیں۔غزل اردو کی مقبول صنف سخن ہے جو فارسی سے اردو ادب میں آئی۔غزل کا ہر شعر اپنی جگہ پورے معنی رکھتا ہے۔غزل میں کم سے کم پانچ اشعار ہوتے ہیں۔غزل کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے جس کے دونوں مصرعے آپس میں ہم ردیف اور ہم قافیہ ہوتے ہیں۔اگر دوسرا شعر بھی مطلع ہو تو اس کو مطلع ثانی کہتے ہیں۔غزل کا وہ شعر جو مطلع کے فوراً بعد آتا ہے حسن مطلع کہلاتا ہے۔غزل مردف اور غیر مردف دونوں طرح کی ہوتی ہے۔ ردیف دار غزل مردف اور بغیر ردیف کی غزل کو غیر مردف کہتے ہیں۔قافیہ کے بعد آنے والے لفظوں کا شمار ردیف میں ہوتا ہے۔ یہ ایک یا ایک سے زیادہ ہو سکتے ہیں۔غزل کا آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلص پیش کرتا ہے مقطع کہلاتا ہے۔ غزل میں شاعر اپنے دلی جذبات کو ظاہر کرتا ہے۔اردو شاعری میں غزل سب سے پرانی صنف ہے۔غزل میں حسن وعشق، زلف، رخسار وغیرہ کی باتیں ہوتی ہیں۔غزل کا اہم وصف تغزل ہے۔

کلاسیکی دور میں غزل کے موضوعات اپنی کثرت کے باوجود ایک دائرے کے اسیر تھے۔برطانوی حکومت کے اثر سے ہندوستان میں اصلاح وترقی کی جو ہوا چلی اس کا اثر اردو ادب پر بھی پڑا، اصناف سخن میں اصلاح اور اضافہ کی فضا ہموار ہوئی۔نظم کو ترقی نصیب ہوئی تو ناول اور افسانے کے باب بھی وا ہوئے۔غزل میں بھی اصلاحی دور کا آغاز ہوا۔ اصلاح کے دور نے ترقی اور وسعتوں کی راہوں کو بھی مسطح کیا۔محمد حسین آزادؔ، حالیؔ، اقبالؔ، حسرتؔ، اصغرؔ، فیضؔ وغیرہ نے غزل کی کلغی میں نئے پنکھوں کا اضافہ کیا اور میر، سودا، غالب، ذوق وغیرہ نے غزل کو جو رنگ وآہنگ دیا تھا اس میں بعد کے زمانے میں تبدیلیاں آئیں۔

بقول رشید احمد صدیقی: ''غزل ایک تاج محل ہے''

بقول رشید احمد صدیقی: ''غزل اردو شاعری کی آبرو ہے''

بقول حسرت موہانی: ''غزل کی بہترین قسم عاشقانہ ہے''

بقول کلیم الدین احمد: ''غزل نیم وحشی صنف سخن ہے''

(1)

مرزا محمد رفیع سوداؔ

[پیدائش 1712ء، وفات 1781ء]

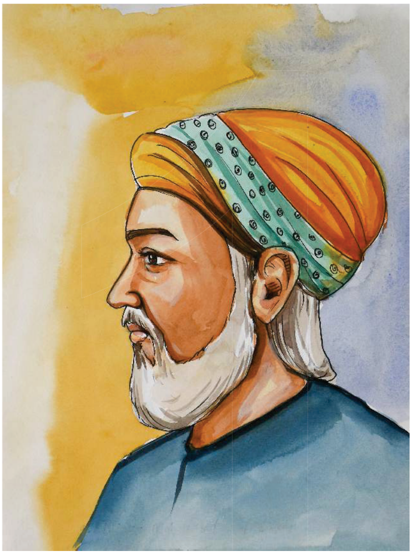

سوداؔ کا اصل نام مرزا محمد رفیع اور سوداؔ تخلص تھا۔ وہ 1712ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد شفیع تجارت کی غرض سے کابل سے دہلی آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ چونکہ ان کا پیشہ سوداگری تھا اس لیے سوداؔ نے اپنا تخلص سوداؔ اختیار کیا۔ کاروبار کافی اچھا تھا اس لیے انھوں نے اپنی زندگی بڑے ٹھاٹ باٹ سے بسر کی۔ شاعری کا ذوق فطری تھا۔ ابتدا میں فارسی میں زور آزمائی کی مگر جلد ہی اردو کی طرف متوجہ ہو گئے۔

شروع میں سلیمان قلی خان سے اصلاح لی۔ بعد میں شاہ حاتمؔ کے شاگرد ہوئے۔ پھر کچھ دنوں بعد خان آرزو کی صحبت سے فیض اٹھایا اور انھیں کی توجہ سے فارسی شاعری چھوڑ کر اردو میں شاعری کی ابتدا کی۔ سوداؔ کئی بادشاہوں اور رؤساء

کے ہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ان کی خوب قدر ومنزلت بھی ہوتی تھی۔

میرؔ اور سوداؔ سے پہلے اردو شاعری ابہام گوئی کے بھنور میں گھری تھی۔اس دور کے شعرا اس صنعت کو نبھانے میں اپنا سارا وقت صرف کر دیتے تھے نہ مضمون کی فکر تھی اور نہ ہی زبان کی۔لیکن جب اس سے آزادی ملی تو بہت تیزی کے ساتھ اردو شاعری نے ترقی کرنا شروع کی۔میرؔ کی غزلوں، سوداؔ کے قصیدوں اور میر حسن کی مثنوی نے بقائے دوام حاصل کیا۔میرؔ اور سوداؔ سے پہلے فارسی شاعری کا رواج تھا۔اس دور کے شعرا منھ کا مزہ بدلنے کے لیے کبھی کبھار اردو میں بھی کچھ کہہ لیتے تھے۔لیکن وقت نے ایسی کروٹ بدلی کہ اصل شاعری تو اردو میں ہونے لگی اور فارسی شاعری کسی درجے پیچھے رہ گئی۔

احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے پے درپے حملے کی وجہ سے دارالسلطنت دہلی تباہ و برباد ہو چکا تھا۔اس لیے حساس طبیعت کے مالک علما، ادبا اور شعرا نے امن کی تلاش میں دہلی چھوڑ کر دیگر مقامات کی طرف ہجرت کرنے شروع کر دی۔ سوداؔ نے بھی امن اور سکون کی تلاش میں فیض آباد اور پھر لکھنؤ کی طرف اپنا رخ کیا۔ان کی زندگی شروع سے آخر تک فراغت کے ساتھ بسر ہوئی۔لکھنؤ میں ان کا چھ ہزار سالانہ وظیفہ مقرر تھا۔

قصیدے، مرثیے، مثنویاں، رباعیاں، شہر آشوب، قطعات، تاریخیں، پہیلیاں، واسوخت، مستزاد، ہجو اور غزلیات گویا سبھی اصناف ان کے کلیات میں موجود ہیں۔سوداؔ نے 29/جون 1781ء کو تقریباً 70 سال کی عمر میں لکھنؤ میں وفات پائی۔ان کی قبر امام باڑہ آغا باقر میں آج بھی موجود ہے۔

اردو قصیدہ نگاری میں جو منفرد اور بلند مقام سوداؔ کو حاصل ہوا وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آیا۔سوداؔ ایک قادرالکلام شاعر تھے۔انھوں نے غزل بھی کہی اور خوب کہی۔ان کی غزلیں سطحی اور معمولی نہیں ہیں۔ان کے کلام میں سوز وگداز، درد وغم کی گہری ٹیس، خستہ حالی تو نہیں جو میرؔ کی غزلوں میں دکھائی دیتی ہے۔لیکن ان کے ہاں رجائیت اور بھرپور تغزل پایا جاتا ہے۔

سوداؔ جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانئے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

سوؔدا نے مروجہ شعری رنگوں کو بڑی کامیابی سے نبھایا ہے۔ مشکل زمینوں میں شعر کہنا، مشکل قافیوں اور ردیفوں کو باندھنا، صنائع و بدائع کا فنکارانہ استعمال ان کی غزلوں میں عام ہے۔ شوکت الفاظ، علوخیال، لہجے کی بلند آہنگی جو قصیدے کی خصوصیات ہیں ان کی غزلوں کو منفرد بناتی ہیں۔ ان کے یہاں عشق ومحبت، ہجر و وصال اور داخلیت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔

جس روز کسی اور پہ بیداد کروگے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کروگے

آپ کا یہ سبق مرزا محمد رفیع سودا کی غزل گوئی سے منسوب ہے۔ جس میں کل تین غزلیں ہیں۔ سوؔدا نے اپنے تخیل کی بلندی اور جوش بیانی سے غزلوں میں کیف ونشاط پیدا کیا ہے۔ عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں طرح کے مضامین ان کی غزلوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

(I)

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا　　موسیٰ نہیں جو سیر کروں کوہِ طور کا

توڑوں یہ آئینہ کہ ہم آغوشِ عکس ہے　　ہووے نہ مجھ کو پاس جو تیرے حضور کا

ہم تو قفس میں آن کے خاموش ہو رہے　　اے ہم صفیر! فائدہ ناحق کے شور کا

سوداؔ کبھی نہ مانیو واعظ کی گفتگو

آوازۂ دہل ہے خوش آیند دور کا

(II)

جی تک تو دے کے لوں کہ ہو کارگر کہیں　　اے آہ کیا کروں نہیں بکتا اثر کہیں

ہوتی نہیں ہے صبح نہ آتی ہے مجھ کو نیند　　جس کو پکارتا ہوں وہ کہتا ہے مر کہیں

خوں ناب یوں کبھو نہ مری چشم سے تھما　　اٹکا نہ جب تک آن کے لختِ جگر کہیں

اے دل تو کہہ تو مجھ سے کہ میں کیا کروں نثار

آویں کبھو جو حضرت سوداؔ ادھر کہیں

(III)

گدا دستِ اہلِ کرم دیکھتے ہیں ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں
نہ دیکھا جو کچھ جام میں جم نے اپنے سو یک قطرۂ مے میں ہم دیکھتے ہیں
غرض کفر سے کچھ نہ دیں سے ہے مطلب تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں
حبابِ لب جو ہیں اے باغباں ہم! چمن کو ترے کوئی دم دیکھتے ہیں
خدا دشمنوں کو نہ وہ کچھ دکھا وے جو کچھ دوست اپنے سے ہم دیکھتے ہیں
مگر تجھ سے رنجیدہ خاطر ہے سوداؔ
اسے تیرے کوچے میں کم دیکھتے ہیں

معنی اور اشارے

سنگ	پتھر
شرار	چنگاری
ظہور	ظاہر ہونا، نمایاں ہونا، جلوہ، تجلّی، رونق، برکت
کوہ طور	ملک شام کی وہ مشہور پہاڑی جس پر خداوند تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی تجلی دکھائی تھی۔ جس کے اثر سے حضرت موسیٰ بے ہوش ہوگئے تھے اور کوہ طور جل کر سرمے کی مانند سیاہ ہوگیا تھا۔
ہم آغوش	بغل گیر، باہم گلے ملنے والا، ہم دوش، ایک دوسرے کی آغوش میں
عکس	تصویر، پرچھائیں، سایہ، پرتو، جھلک، شکل، شبیہ جو آئینے میں دکھائی دے۔
خوش آیند	دل کش، پسندیدہ، نیک شگون، نیک فال، خوشگوار
پاس	لحاظ
قفس	قید خانہ، جیل، جال، پنجرہ
ہم صفیر	ہم خیال، رفیق، ساتھی، ہم جنس، ہم نوا
واعظ	نصیحت، پند، ہدایت اور تلقین کرنے والا
آوازۂ دُہل	نقّارہ کی آواز، ڈنکے کی آواز
خوں ناب	خون کے آنسو
چشم	آنکھ
گدا	بھکاری، مفلس، نادار
جم	جمشید کا مخفف، بڑا بادشاہ

دیر وحرم	بت خانہ اور مسجد
لبِ جو	نہر کا کنارہ، ندی کا کنارہ
رنجیدہ خاطر	مغموم، ملول، جس کا دل مغموم ہو
حباب	پانی کا وہ قطرہ جو ہوا بھرنے سے پھول کر اوپر ابھر آتا ہے۔ بلبلا

معروضی سوالات:

1۔ سودؔا کا اصل نام کیا تھا؟

(i) محمد رفیع سودا　(ii) محمد شفیع

(iii) محمد سمیع　(iv) محمد کفیل

2۔ سودؔا کا سنۂ پیدائش کیا ہے؟

(i) 1712ء　(ii) 1735

(iii) 1748　(iv) 1781

3۔ سودا کو پہلوان سخن کس نے کہا تھا؟

(i) آرزو　(ii) حاتؔم

(iii) سلیمان قلی خان　(iv) ناسؔخ

3۔ ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا　موسیٰ نہیں جو سیر کروں کوہِ طور کا

اس شعر میں کون سی صنعت استعمال کی گئی ہے؟

(i) تلمیح　(ii) تضاد

(iii) تشبیہ　(iv) حسن تعلیل

5۔ قصیدے کا بادشاہ کسے کہا جاتا ہے؟

(i) ذوقؔ (ii) غالبؔ

(iii) سوداؔ (iv) مومنؔ

مختصر ترین سوالات:

1۔ سوداؔ کی وفات کب اور کہاں ہوئی؟

2۔ میرؔ اور سوداؔ سے پہلے اردو شاعری کس بھنور میں گھری ہوئی تھی؟

مختصر سوالات:

1۔ سوداؔ نے غزل کے علاوہ کن اصناف میں طبع آزمائی کی؟

2۔ سوداؔ کی غزل گوئی کی نمایاں خصوصیات بیان کیجیے۔

تفصیلی سوالات:

1۔ مرزا سودا کے حالات زندگی پر روشنی ڈالیے۔

2۔ درج ذیل اشعار کی تشریح کیجیے۔ اور ان میں کون سی صنعتیں استعمال کی گئی ہیں؟ وضاحت کیجیے۔

(i) ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا
موسیٰ نہیں جو سیر کروں کوہِ طہور کا

(ii) توڑوں یہ آئینہ کہ ہم آغوشِ عکس ہے
ہووے نہ مجھ کو پاس جو تیرے حضور کا

(iii) غرض کفر سے کچھ نہ دیں سے ہے مطلب
تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں

3۔ نہ دیکھا جو کچھ جام میں جم نے اپنے
سو یک قطرۂ مے میں ہم دیکھتے ہیں

اس شعر کی تشریح کیجیے؟

(2)

شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ

[پیدائش 1789ء، وفات 1854ء]

ذوق کا اصل نام شیخ محمد ابراہیم اور تخلص ذوقؔ تھا۔ ان کی پیدائش 1789ء میں دہلی میں ہوئی۔ ان کے والد شیخ محمد رمضان دہلی کے کابلی دروازے میں رہتے تھے اور ان کا آبائی پیشہ ظروف سازی کا تھا۔ ذوق نے ابتدائی تعلیم مولانا عبدالرزاق کے مدرسے سے حاصل کی۔ اسی مدرسے میں محمد باقر سے ذوق کی دوستی ہوئی جو تمام عمر تک باقی رہی۔ محمد باقر محمد حسین آزاد کے والد تھے جنھوں نے ''اردو اخبار'' شائع کیا۔ یہ شمالی ہند کا پہلا اردو اخبار تھا۔ اس اخبار میں انگریزوں کے خلاف مضامین چھپنے کی پاداش میں انھیں پھانسی کی سزا ہوئی۔ ذوق مدرسے سے نکل کر حافظ غلام رسول شوقؔ کے مکتب میں داخل ہوئے۔ شوق کو شاعری کا شوق تھا۔ ان کی صحبت میں ذوق کو بھی شاعری سے دلچسپی ہوئی اور اپنا کلام ان کو دکھانے

لگے۔ کہا جاتا ہے کہ شوق کی ایما پر ہی انھوں نے اپنا تخلص ذوقؔ رکھا۔ لیکن جلد ہی نصیر جیسے استاد فن کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کی باقاعدہ شاگردی اختیار کرلی۔ شاہ نصیر جب دکن چلے گئے تو ذوقؔ کو بادشاہ کے استاد کے منصب پر سرفراز کیا گیا۔ اور دربار سے ''خاقانی ہند'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ ان کی وفات 1854ء میں ہوئی۔

اردو ادب میں ذوقؔ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ بڑے باکمال شاعر ہیں۔ غزل اور قصیدہ دونوں میں ان کا اعلیٰ مقام ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اپنے سرمایہ سخن کی حفاظت وہ نہیں کرسکے جو کچھ لکھا کرتے تھے اپنے تکیے کے غلاف میں بھر کر رکھ دیتے تھے۔ اکثر ایسا ہوا کہ تکیہ کا غلاف دھلنے گیا تو کلام بھی صاف ہوگیا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے شیخ محمد اسماعیل فوق اور محمد حسین آزاد نے مل کر ان کے دیوان کو ترتیب دیا جو 1859ء میں منظر عام پر آیا۔ اس میں 24 قصائد اور 280 غزلیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ذوق نے مختلف علوم مثلاً نجوم، فلسفہ، تصوف، موسیقی، منطق اور طب وغیرہ میں اچھی دست گاہ پیدا کی تھی۔ ان کی علمی شخصیت کے شواہد ان کی شاعری میں جابجا ملتے ہیں۔ ذوقؔ نے جس وقت شاعری شروع کی وہ کلاسیکی شاعری کا زمانہ تھا۔ ناسخؔ نے غزل کو دل سے نہیں دماغ سے سوچنے کی چیز بنا دیا تھا اور آتشؔ نے غزل کے آبگینے کو زندگی اور عشق کی حرارت دے کر تابندہ کر دیا تھا۔ ایسے وقت میں ذوقؔ کا وسیع مطالعہ، فلسفہ، حکمت اور تصوف کے رموز و نکات سے واقفیت نے ان کو اپنی غزل میں وہی مضامین باندھنے پر مجبور کیا جو صدیوں سے مستعمل تھے۔ چونکہ وہ با اخلاق، باکردار، نیک نفس انسان تھے اس لیے ان کے کلام میں اخلاقی اور واعظانہ مضامین جابجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیے۔

منھ سے بس کرتے ، کبھی یہ نہ خدا کے بندے
گر حریصوں کو خدا ساری خدائی دیتا

نام منظور ہے تو ، فیض کے سامان بنا
پل بنا ، چاہ بنا ، مسجد و تالاب بنا

ان کی زبان سادہ، عام فہم اور روزمرہ کے مطابق ہوتی ہے۔ اس لیے ان کے اشعار آج تک زبان زد خاص و عام ہیں۔

ذوقؔ کی غزلوں پر قصیدے کا رنگ غالب ہے۔ وہ محاورۂ دلی، تشبیہوں اور استعاروں کے بادشاہ تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے وسیلے سے دہلوی زبان کا ایک معیار قائم کیا۔ ان کے شاگردوں میں بہادر شاہ ظفر کے علاوہ محمد حسین آزاد، داغؔ، ظہیرؔ اور انورؔ نے بہت نام کمایا۔ ذوقؔ کے ہم عصروں میں غالب جیسا جید شاعر بھی تھا جس سے ذوق کے کئی معرکے رہے۔

زیرِ درس سبق ذوق کی مشہور منتخب غزلیں ہیں جو اپنے مضامین کے اعتبار سے منفرد ہیں۔ زبان و بیان کے اعتبار سے یہ غزلیں اعلیٰ معیار کی حامل ہیں۔ اخلاقی اور واعظانہ انداز ان غزلوں میں باقاعدہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ذوق کے مزاج میں ایک فقیرانہ شان اور صوفیانہ انکسار تھا۔ انھوں نے پہلی غزل میں فنا فی اللہ کا مسئلہ اٹھایا ہے۔ اللہ کا جلوہ ہر شے میں ہے مگر ہم اس کا شعور نہیں رکھتے۔ انسان ایک قطرہ کے مانند ہے یہ قطرہ سمندر یعنی ذات باری تعالیٰ میں ڈوب جاتا ہے تو کھوجنا ممکن نہیں بالکل اسی طرح جس طرح کسی بالٹی میں پانی ہو اور اس میں رنگین پانی کا ایک قطرہ ڈال دیا جائے تو وہ قطرہ بالٹی کے پانی میں اس طرح گھل مل جاتا ہے کہ اس کو ڈھونڈ نا مشکل ہو جاتا ہے۔ غزل نمبر ۳ میں ذوق نے ناصحانہ مطلع پیش کیا ہے کہ بڑھاپے میں آ کر کوئی شباب، عشق و محبت کی بات کرے تو عقل بھی حیران ہوتی ہے کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں جس طرح آنکھ کھلنے کے بعد خواب کی کوئی حقیقت نہیں ٹھیک اسی طرح پیری میں نوجوانی کی بات کرنا نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح کے متفرق و منفرد مضامین بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ذوق نے اپنی غزلوں میں شامل کئے ہیں۔

(I)

اسے ہم نے بہت ڈھونڈا ، نہ پایا اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا
جس انساں کو سگِ دنیا نہ پایا فرشتہ اس کا ہم پایا نہ پایا
مقدّر ہی پہ گر سود و زیاں ہے تو ہم نے کچھ یہاں کھویا نہ پایا
سراغِ عمرِ رفتہ ہو تو کیوں کر کہیں جس کا نشانِ پا نہ پایا
احاطے سے فلک کے ہم تو کب کے نکل جاتے مگر رستا نہ پایا
کہے کیا ہائے زخم دل ہمارا
دہن پایا لب گو یا نہ پایا

(II)

بلبل ہوں صحنِ باغ سے دور اور شکستہ پر پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر
کیا ڈھونڈے دشتِ گمشدگی میں مجھے کہ ہے عنقا مرے سراغ سے دور اور شکستہ پر
کرتا ہے دل کا قصد کماں دار تیرا تیر پر ہے نشانِ داغ سے دور اور شکستہ پر
اس مرغِ ناتواں پہ ہے حسرت جو رہ گیا مُرغانِ کوہ و راغ سے دور اور شکستہ پر
خود اڑ کے پہنچے نامہ جو ہو مرغِ نامہ بر اس شوخِ خوش دماغ سے دور اور شکستہ پر
اے ذوقؔ میرے طائرِ دل کو کہاں فراغ
کوسوں ہے وہ فراغ سے دور اور شکستہ پر

(III)

وقتِ پیری شباب کی باتیں ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

مجھ کو رسوا کریں گی خوب اے دل یہ تری اضطراب کی باتیں

سنتے ہیں اس کو چھیڑ چھیڑ کے ہم کس مزے سے عتاب کی باتیں

ذکر کیا ، جوشِ عشق میں اے ذوقؔ

ہم سے ہوں صبر و تاب کی باتیں

معنی اور اشارے:

سگِ دنیا	طالب دنیا، لالچی، حریص، دنیادار آدمی
سودوزیاں	فائدہ اور نقصان، نفع ونقصان
عمر رفتہ	وہ زندگی جو گزر چکی، پچھلی زندگی، بیتا ہوا وقت
لب گویا	بولنے والا ہونٹ
دہن	منھ
دشت	جنگل یا میدان، صحرا، ویرانہ، ریگستان
عنقا	نایاب، نادر، معدوم، غائب، خیالی پرندہ
شکستہ	ٹوٹا ہوا
مرغان	پرندے
کوہ وراغ	پہاڑ سے نکلنے والا شعلہ، کوہ سے نکلنے والا نور، روشنی
قصد	ارادہ، نیت، عزم، کوشش، اقدام
طائر	پرندہ
اضطراب	بےچینی، گھبراہٹ
عِتاب	ناز کرنا، غصہ ہونا، خفا ہونا
صبروتاب	صبر وسکون

معروضی سوالات

1۔ ذوقؔ کی پیدائش کب ہوئی؟

(i) 1854ء (ii) 1862ء

(iii) 1789ء (iv) 1880ء

2۔ ذوقؔ کے والد کا نام کیا تھا؟

(i) شیخ غلام روضان (ii) شیخ محمد رمضان

(iii) شیخ انجان (iv) شیخ انعام

3۔ کس شاعر کو ''خاقانی ہند'' کا خطاب ملا؟

(i) غالبؔ (ii) مومنؔ

(iii) ذوقؔ (iv) داغؔ

4۔ ذوقؔ کا دیوان کب شائع ہوا؟

(i) 1859ء (ii) 1789ء

(iii) 1959ء (iv) 2000ء

مختصر ترین سوالات:

1۔ ذوق کے استاد کا کیا نام تھا؟

2۔ ذوق کے دو شاگردوں کے نام بتائیے؟

مختصر سوالات:

1۔ غزل گوئی میں ذوق کا کیا امتیاز ہے؟

2۔ غالبؔ کی غزل پر کس صنف کا رنگ غالب ہے؟

3۔ ذوقؔ کی وفات کب اور کہاں ہوئی ؟

تفصیلی سوالات:

1۔ ذوق کے حالات زندگی اور ان کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

2۔ مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کیجیے۔

سراغِ عمرِ رفتہ ہو تو کیوں کر
کہیں جس کا نشانِ پا نہ پایا

کیا ڈھونڈے دشتِ گمشدگی میں مجھے کہ ہے
عنقا مرے سراغ سے دور اور شکستہ پر

(3)

مرزا اسد اللہ غالبؔ

[پیدائش1869ء، وفات 1797ء]

غالبؔ اردو ادب کی ایک رنگا رنگ اور باغ و بہار شخصیت ہیں۔ان میں قدامت کے آثار بھی ہیں اور جدیدیت کی خوشبو بھی۔ وہ سنجیدہ بھی ہیں تو بزلہ سنج بھی،صوفی مزاج بھی ہیں تو رند مست بھی۔غزل گوئی میں باکمال و بے نظیر ہیں تو مکتوب نگاری کے امام۔ان کی شہرت جتنی شاعر کی حیثیت سے ہے اس سے کم شہرت نثر نگاری میں بھی نہیں ہے۔ وہ ایک نادر روزگار شخصیت تھے۔ان جیسی شخصیت عالمی ادب میں بھی کمیاب ہے۔

مرزا غالبؔ کی ولادت 1797ء میں کو آگرے میں ہوئی۔ والد کے انتقال ہو جانے کے بعد ان کے چچا نصراللہ بیگ نے ان کی پرورش کی۔شادی کے بعد غالبؔ دہلی آ گئے۔ یہاں کے علمی اور ادبی ماحول میں ان کے شعری ذوق کی

تربیت ہوئی۔

غالب کو فارسی اور اردو دونوں زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ انھیں اردو سے زیادہ اپنی فارسی دانی پر فخر تھا۔ انھوں نے کبھی اپنی فارسی شاعری پر ناز کرتے ہوئے اردو شاعری کو ''بے رنگ من است'' کہا تو کبھی اردو شاعری کو رشک فارسی قرار دیا۔

غالب ایک عظیم شاعر اور فن کار ہیں، ان کی عظمت کا ثبوت یہ ہے کہ تغیر زمانہ بھی ان کے کلام کی فکری بلندی کو کم نہ کر سکا۔ غالب سے قبل شعرا کے کلام میں موضوعات محدود تھے۔ چند موضوعات خصوصی طور پر عشق و عاشقی کے موضوعات کی تکرار ہوتی تھی۔ انھوں نے اردو غزل کو سوچنا سکھایا۔ غالب فلسفیانہ سوالات کے ذریعے اپنے تجسس بیان کرتے ہیں۔ اور یہ فلسفیانہ سوالات روز اول ہی سے انسانی اذہان کو چیلنج کرتے رہے ہیں۔ غالبؔ اپنے کلام میں فنا و بقا، حقیقت و ہستی، ہمدردی و انسان دوستی کے جذبات کو موثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ تصوف کے مسائل کو اپنے خاص انداز میں بیان کرتے ہیں جو انھیں کا خاصہ ہے۔ غالب کو حیوانِ ظریف کا لقب دیا گیا ہے۔ طنز و ظرافت غالبؔ کی سرشت کا حصہ ہے۔ وہ اپنی ذات کو طنز و تمسخر کا نشانہ بناتے ہیں۔ مشکل الفاظ و ترکیب، پیچیدہ خیالات و افکار، جدید تشبیہات و استعارات نے ان کے کلام کو بعض مقامات پر مشکل بنا دیا ہے۔ لیکن ان میں بھی معنوی تہہ داری اور صوری دلکشی کی کارفرمائی ہے۔

(I)

جَور سے باز آئے ، پر باز آئیں کیا　　کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا
رات دن گردش میں ہیں سات آسماں　　ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ　　جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا
موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے　　آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا
عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ　　مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا
پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

(II)

درد منت کشِ دوا نہ ہوا　　میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو　　اک تماشا ہوا گِلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں　　تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب　　گالیاں کھاکے بے مزا نہ ہوا
ہے خبر گرم ان کے آنے کی　　آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

(III)

آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہرا ہونے تک

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

اک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل گرمیِ بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

معنی اور اشارے:

گردش	چکّر
آستان	چوکھٹ
لاگ	دشمنی
درد	بمعنی مرضِ عشق
منت کش	احسان مند، ممنون
رقیب	حریف، دشمن، رفیق
گلہ	شکایت
شیریں	میٹھا
موج	اُمنگ، جوش
صدکام نہنگ	سیکڑوں مگرمچھوں کا تالاب
گہر	موتی
پرتوِ خور	سورج کی روشنی
شبنم	اوس، مہربانی
عنایت	مہربانی، توجہ
فرصت ہستی	زندہ رہنے کا وقفہ
بزم	محفل، مجلس
جز	سوائے، علاوہ

سحر — صبح کا تڑکا

معروضی سوالات:

1۔ غالبؔ کا سنِ پیدائش کیا ہے؟

(i) 1797 — (ii) 1780

(iii) 1795 — (iv) 1785

2۔ پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔ — اس شعر میں کون سی صنعت ہے۔

(i) تضاد — (ii) تشبیہ

(iii) تجاہل عارفانہ — (iv) استعارہ

3۔ ''کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک'' اس شعر کا یہ پہلا مصرع ہے۔

(i) دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ — (ii) دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

(iii) ایک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل — (iv) آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک

4۔ لفظ ''لاگ'' کے کیا معنی ہیں؟

(i) دوستی — (ii) دشمنی

(iii) کانٹا — (iv) چکّر

5۔ غالبؔ کا پورا نام کیا تھا؟

(i) مرزا غالب — (ii) مرزا اسد

(iii) اسداللہ — (iv) مرزا اسداللہ خاں غالبؔ

مختصر ترین سوالات:

1۔ غالبؔ کی وفات کب اور کہاں ہوئی ؟

2۔ صنعت تجاہل عارفانہ سے آپ کا کیا سمجھتے ہیں؟ مثال کے ساتھ لکھیے ۔

مختصر سوالات:

1۔ غالبؔ نے اپنی اردو شاعری کو کیا کہا؟

2۔ غالبؔ کی غزل گوئی کی خصوصیات بیان کیجیے۔

تفصیلی سوالات:

1۔ اردو ادب میں غالبؔ کی انفرادیت کیا ہے؟ واضح کیجیے۔

2۔ غالبؔ کے حالاتِ زندگی اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

3۔ ''غالبؔ کی شاعری ان کے عہد کی آئینہ دار ہے'' مثالوں سے واضح کیجیے۔

(4)

مومن خاں مومن

[پیدائش 1800ء، وفات 1852ء]

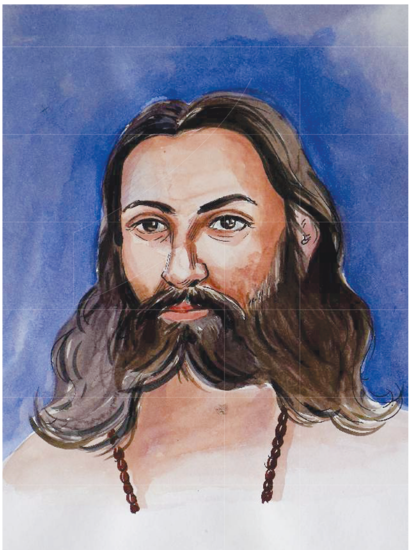

مومن خان نام تھا۔مومن تخلص فرماتے تھے۔غلام نبی خان کے بیٹے تھے۔مومن 1800ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔عربی کی تعلیم مولانا شاہ عبدالقادر سے حاصل کی۔ابتدا میں شاہ نصیر سے اصلاح لیتے رہے۔پھر خود ہی محنت کر کے شاعری کے فن میں کمال حاصل کیا۔مزاج میں شگفتگی اور زندہ دلی تھی۔مومن ایک بلند پایہ شاعر تھے،نازک خیالی اور مضمون آفرینی ان کی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں۔زبان بڑی صاف ستھری استعمال کرتے تھے۔مومن نے اپنی شاعری میں نادر تشبیہات و استعارات کا استعمال کیا ہے۔ان کے خیالات میں بڑی لطافت پائی جاتی ہے۔معاملہ بندی نہایت نازک چیز ہے۔مگر مومن نے جس خوش اسلوبی سے اس کو پیش کیا ہے وہ بے مثل ہے۔

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مومن کے کلام کی سب سے بڑی خوبی مکرِ شاعرانہ ہے، تازہ کاری، جدّت طرازی بھی ان کے کلام کی خصوصیات میں شامل ہے:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یہی وہ شعر ہے جس کے متعلق غالب نے کہا تھا کہ مومن کو اس شعر کے بدلے میں اپنا پورا دیوان دے سکتا ہوں۔ مومن کا دیوان 1846ء میں شائع ہو۔ ان کی وفات 1852ء میں کوٹھے سے گرنے کی وجہ سے ہوئی۔ وہ محسوسات کے شاعر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں حواس کو متاثر کرنے کا بڑا سامان موجود ہے۔ مومن کی غزلیں فنی اور جمالیاتی پہلو سے بھی ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے غزل کے بنیادی اصولوں کو بڑی چابکدستی کے ساتھ برتا ہے۔ مومن کی زبان میں سادگی اور بیان دلکشی پائی جاتی ہے۔ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر سادہ سے سادہ شعر میں بھی معنی کی ایک دنیا آباد کر جاتے ہیں۔

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

(I)

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا　　رنج راحت فزا نہیں ہوتا
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے　　ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں　　سو تمھارے سوا نہیں ہوتا
کیوں سنے عرض مضطرب مومنؔ
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

(II)

اس وسعتِ کلام سے جی تنگ آ گیا　　ناصح تو میری جان نہ لے دل گیا ، گیا
ضد سے وہ پھر رقیب کے گھر میں چلا گیا　　اے رشک! میری جان گئی تیرا کیا گیا
کچھ آنکھ بند ہوتے ہی آنکھیں سی کھل گئیں　　جی اک بلائے جان تھا اچھا ہوا گیا
آنکھیں جو ڈھونڈھتی تھیں نگہ ہائے التفات　　گم ہونا دل کا وہ مری نظروں سے پا گیا
آہ سحر ہماری فلک سے پھری نہ ہو
کیسی ہوا چلی کہ یہ جی سنسنا گیا

(III)

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم　　پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم
ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی سے کسی کو ہم　　منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم
ہم سے نہ بولو تم اسے کیا کہتے ہیں بھلا　　انصاف کیجے پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم
اس کُو میں جا مریں گے ، مدد اے ہجومِ عشق!　　آج اور زور کرتے ہیں بے طاقتی سے ہم

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں
مومنؔ نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

معنی اور اشارے:

راحت فزا	راحت بخشنے والا، آرام دینے والا
چارہ	علاج
صنم	بت، محبوب
ناچار	مجبور
دشت	جنگل
مضطرب	بے چینی، بے قرار
وسعت کلام	کلام کا پھیلاؤ
رقیب	دشمن
بلائے جاں	جان کے لیے مصیبت
التفات	توجہ
سحر	صبح
فلک	آسمان
کُو	کوچہ
بے طاقتی	کمزوری
ربط	تعلق
بدعتی	مذہب میں کوئی نئی بات پیدا کرنے والا

معروضی سوالات:

1۔ مومن کا اصل نام کیا تھا؟

(i) محمد خان (ii) دلاور خان

(iii) مومن خان (iv) احمد خان

2۔ مومن کے والد کا نام کیا تھا۔

(i) غلام نبی خان (ii) محمد حسین

(iii) میر خلیق (iv) شاہ نصیرالدین

3۔ مومن کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

(i) 1800 بنارس (ii) 1818 دہلی

(iii) 1800 دہلی (iv) 1805 لکھنؤ

4۔ مومن کی وفات کب اور کہاں ہوئی۔

(i) 1852 دہلی (ii) 1850 لکھنؤ

(iii) 1885 بنارس (iv) 1880 دہلی

5۔ مومن کی شاعری کے استاد کون تھے؟

(i) شاہ نصیر (ii) احمد شاہ

(iii) نواب مرزا خان (iv) افضل علی خان

6۔ مومنؔ نے عربی کی تعلیم کس سے حاصل کی؟

(i) عبدالقادر دہلوی (ii) عبدالحق دہلوی

(iii) اسمٰعیل دہلوی (iv) عبدالرحیم دہلوی

7۔ مکرِ شاعرانہ کس کی شاعری میں پایا جاتا ہے؟

(i) مومن (ii) میر تقی میر

(iii) غالب (iv) حسرت

مختصر ترین سوالات:

1۔ مومن کا دیوان کس سنہ میں شائع ہوا؟

2۔ مومن کی وفات کس وجہ سے ہوئی؟

مختصر سوالات:

1۔ ''چارۂ دل سوائے صبر نہیں'' میں سوائے صبر سے کیا مراد ہے؟

2۔ مومن کی شاعرانہ خصوصیات اپنے لفظوں میں لکھیے۔

3۔ تم مرے پاس ہوتے ہو گویا / جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اس شعر کے لیے غالب نے مومن سے کیا کہا تھا؟

تفصیلی سوالات:

1۔ اردو شاعری میں مومن کی انفرادیت واضح کیجیے۔

2۔ مومن کے حالاتِ زندگی پر مختصر نوٹ لکھیے۔

3۔ مومن کے فنّی اوصاف پر روشنی ڈالیے۔

(5)

آرزو لکھنوی

[پیدائش 1872ء، وفات 1951ء)

آرزو لکھنوی خاندان سادات میں 1872ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام سید انور حسین تھا۔ ان کے والد میر ذاکر حسین یاسؔ شاعر تھے۔ آرزو لکھنوی نے ابتدائی تعلیم کے حصول کے بعد عربی اور فارسی کے مروجہ علوم لکھنؤ کے مشہور ومعروف اساتذہ سے حاصل کیے۔ ادب وفن کے مطالعہ سے ان میں شعری ذوق عہد طفلی ہی سے پیدا ہو گیا تھا۔ وہ جلالؔ لکھنوی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوئے اور ان سے اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے۔ جلالؔ لکھنوی زبان کی صحت اور صفائی اور اصلاح زبان کے تعلق سے شہرت رکھتے تھے۔ وہ ناسخ کے شاگرد علی اوسط رشک کے شاگرد تھے اور ناسخ کی تحریک اصلاح زبان کے پاسبان تھے۔ اصلاح زبان کی ناسخی روایت کو آرزو لکھنوی نے زندہ بھی رکھا اور آگے بھی بڑھانے کی سعی کی۔ آرزوؔ کے کلام میں اور خصوصاً غزلوں میں درد، رنج والم جیسی عشق کی کیفیات وواردات کے ساتھ ایک پر کیف اور لطیف جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔

اندھیرے گھر میں کبھی چاندنی نہیں آتی
ہنسی کی بات پہ بھی اب ہنسی نہیں آتی

آرزو کے کلام میں معاملہ بندی کا عنصر دیگر لکھنوی شعرا کے مقابلے میں نہایت معتدل انداز میں آیا ہے۔ اس کا سبب ان کی زبان کی شیرینی ولطافت اور صفائی ہے۔ محاورات اور ضرب الامثال کے برمحل استعمال نے ان کے اشعار کو دو آتشہ بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

آرزو لکھنوی ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے غزلوں کے علاوہ شاعری کی دیگر اصناف مرثیہ گوئی، نعت گوئی، سلام گوئی، قصیدہ گوئی، مثنوی نگاری، گیت، رباعی اور تاریخ گوئی پر بھی کامیاب طبع آزمائی کی ہے۔ علاوہ بریں انھیں نظم گوئی کے ساتھ نثر پر بھی زبردست قدرت تھی۔ انھوں نے اسٹیج ڈرامے بھی تحریر کیے اور برجستہ مکالمے بھی لکھے۔

ان کے کلام کے چار مجموعے شائع ہوئے ہیں: فغانِ آرزو، جہانِ آرزو، بیانِ آرزو اور سریلی بانسری خالص اردو سے متعلق 'سریلی بانسری' ایسا شعری مجموعہ ہے جس میں فارسی عربی کے الفاظ نہیں ہیں۔ اس سے آرزو کی شہرت اور بڑھی جسے ان کا امتیاز سمجھا جانے لگا۔ آرزو لکھنوی کا شمار باکمال شعرائے اردو میں کیا جاتا ہے۔ اُن کی وفات 17 / اپریل 1951ء کو کراچی، پاکستان میں ہوئی

(I)

جو سخن اس زبان سے نکلا　　تیر گویا کمان سے نکلا

کم نہ تھی تیغ سے ادائے خرام　　دوست دشمن کی شان سے نکلا

دل ہجوم ہوس سے نکلا خوب　　اور بڑی آن بان سے نکلا

امتحاں میں وہ بے وفا بے مہر　　بڑھ کے میرے گمان سے نکلا

آرزؔو عشق میں ہے پیرِ طریق
یہ چلن اس جوان سے نکلا

(II)

بہت دل لبھایا دل آزار ہوکر　　کھلے پھول بن کر چُبھے خار ہوکر

زباں کو تو یارا نہیں ذکر غم کا　　کچھ آنکھیں ہی کہہ جائیں خوں بار ہوکر

پہنچتے ہیں ان تک پہنچ جانے والے　　تہِ تیغ ہو کر سرِ دار ہو کر

خجالت کی آئینہ بندی ہے ہرسو　　کدھر جاؤں میں ان سے بے زار ہوکر

کلامِ خودی آرزؔو بے خودی میں
چھلکنے لگا ظرفِ سرشار ہو کر

(III)

جو سامنے اب تک آئے نہیں، کیوں دھیان میں آئے جاتے ہیں
آنکھوں سے ابھی تک اوجھل ہیں ، اور جی میں سمائے جاتے ہیں

جینا ہے تو دکھ بھی ہیں سکھ بھی ، رونا بھی ہے ہنسنا بھی ہے
بین ایک ہی ہوتی ہے جس پر ، سب راگ بجائے جاتے ہیں

ہٹ اپنی اپنی بات کی ہے ، دھیان اپنی اپنی آن کا ہے
ہم ہیں کہ تُلے ہیں مٹنے پر ، وہ ہیں کہ مٹائے جاتے ہیں

اب آرزو اس پُھلواری میں ، بسنے کا سہارا کوئی نہیں
وہ سوکھے تنکے لا کے رکھو ، تو وہ بھی جلائے جاتے ہیں

معنی اوراشارے:

سخن	شعر،کلام
تیغ	تلوار
خرام	نازوادا کی چال
ہجوم ہوس	خواہشات کی بہتات
آزار	تکلیف، بیماری
خار	کانٹا
خوں بار	خون برسانے والا
خجالت	ندامت،شرمندگی
سو	طرف
دار	پھانسی
سرشار	مخمور
بےخودی	مستی، بے ہوشی

معروضی سوالات:

1۔ دبستانِ لکھنؤ سے کس شاعر کا تعلق ہے؟

(i) امام بخش ناسخ (ii) خواجہ حیدر علی آتش

(iii) انشاءاللہ خان انشاء (iv) سبھی کا

2۔ کس شاعر کا مجموعہ فقط اردو الفاظ پر مشتمل ہے؟

(i) غالبؔ (ii) اقبالؔ

(iii) سوداؔ (iv) آرزوؔ

3۔ 'سریلی بانسری' کس شاعر کا شعری مجموعہ ہے؟

(i) آتشؔ (ii) ناسخؔ

(iii) انشاءؔ (iv) آرزوؔ

4۔ لفظ 'خار' کے کیا معنی ہیں؟

(i) تلوار (ii) پھول

(iii) کانٹا (iv) پھل

5۔ آرزو لکھنوی کا سنۂ پیدائش کیا ہے؟

(i) 1872 (ii) 1880

(iii) 1875 (iv) 1890

مختصر ترین سوالات:

1۔ آرزوؔ لکھنوی نے اپنے کلام پر کس سے اصلاح لی؟

2۔ آرزوؔ لکھنوی کا اصل نام کیا ہے؟

مختصر سوالات:

1۔ آرزوؔ لکھنوی کے استاد کا نام لکھیے؟

2۔ آرزوؔ لکھنوی کی شعری خصوصیات اپنے الفاظ میں لکھیے۔

تفصیلی سوالات:

1۔ آرزوؔ لکھنوی کے حالاتِ زندگی اور ادبی کارناموں کا جائزہ لیجیے۔

2۔ آرزوؔ لکھنوی کی شاعری کے بنیادی اوصاف بیان کیجیے۔

(6)

ریاضؔ خیرآبادی

[پیدائش 1853ء، وفات 1934ء]

ریاض خیرآبادی اردو شاعری میں خمریات کی شاعری کے لیے جانے جاتے ہیں۔ ریاض خیرآبادی کا نام ریاض احمد تھا۔ وہ 1853ء میں اتر پردیش کے ضلع سیتاپور کے قصبہ خیرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید طفیل احمد پولیس انسپکٹر تھے۔ ریاض نے اپنی تعلیم کی ابتدا زمانہ کے رواج کے مطابق فارسی سے کی۔

ریاض کی ادبی زندگی خیرآباد ہی سے شروع ہوگئی تھی۔ تکمیل تعلیم کے کچھ ہی عرصہ بعد انھوں نے ریاض الاخبار نکال دیا۔ پھر روزنامہ تار برقی اور گل کدۂ ریاض وہیں سے جاری کیا۔ اسی زمانے میں شعروشاعری سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ پہلے آشفتہ اور پھر ریاضؔ تخلص اختیار کیا اور اپنے زمانہ کے مشہور استاد شاعر امیر مینائی سے اصلاح لی۔ 1934ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

ریاض کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور ابتدائی شاعری کا جس میں وہ غالبؔ کا تتبع کرتے نظر آتے ہیں۔ دوسرا دور گورکھپور کی شاعری کا جس میں ان کا اپنا انداز کھل کر سامنے آتا ہے جو حقیقی معنوں میں ان کی شہرت کا باعث ہوا اور پھر تیسرا دور جس میں جوانی کا جوش سرد پڑ گیا۔ ریاض کی خمریہ شاعری کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ موجودہ زندگی میں مست رہنا اور دنیا کی نیرنگیوں میں ساقیِ ازل کے حسن کو پہچاننے کی کوشش کرنا چاہیے۔ انھوں نے شراب اور اس کے لوازمات کو اپنے قوتِ تخیل کے سہارے نئے معنی ومفاہیم دیے اور اسے جذبات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ ان کی شراب مجازی بھی ہے اور شرابِ معرفت بھی۔ ان کی شاعری میں شیخ، واعظ اور ناصح پر پھبتیاں بھی ملتی ہیں۔

ریاض کی عشقیہ شاعری میں لکھنؤ کی رنگین شاعری کا عکس نمایاں ہے۔ ریاض کی شاعری میں جنسیات کا پہلو نمایاں ہے۔ آخری زمانہ کے کلام میں ریاض کے یہاں المیہ اور طنزیہ شاعری کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ مجموعی طور پر ریاض کی اہمیت اور خصوصیت اردو کے اک ایسے شاعر کے طور پر ہے جس نے خمریات کے مضامین سے اپنی شناخت قائم کی اور اس سے اپنے دیوان کو سجایا۔ ریاض نے شراب کے موضوع کو اردو زبان میں اپنا لیا ہے۔ ان کے یہاں شراب کے مضامین میں بے ساختگی، طرزِ بیان اور جذباتی ندرت کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ شراب کا جیسا بیان مزے لے لے کر ریاضؔ نے کیا ہے ویسا اردو کے کسی شاعر نے نہیں کیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ریاض نے خود زندگی بھر کبھی شراب چکھی بھی نہیں۔ 30 ر جولائی 1934ء کو خیر آباد میں انتقال فرمایا۔

(I)

ہنگام نزع گریہ یہاں بے کسی کا تھا تم ہنس پڑے یہ وقت بھلا کیا ہنسی کا تھا
اٹھّے نہ میری گور سے پھر وہ بھی بیٹھ کر کیا عالم آج ہائے مری بے کسی کا تھا
مے چھین کر کسی سے جو پیتے تو تھی خطا جب دام دے کے پی تو گنہ کیا کسی کا تھا
یہ اپنی وضع اور یہ دشنامِ مے فروش سن کر جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا
دنیا کی کاہشوں سے ہمیشہ رہا اداس
پر آدمی ریاضؔ عجب دل لگی کا تھا

(II)

ہمارے شیشہ و ساغر ہیں یہ مہ و خورشید ہمارے پینے کا اک خُم ہے آسمان نہیں
ازل میں دیکھ چکے سن چکے مگر پھر بھی یہ بات کیا ہے کسی کے بھی آنکھ کان نہیں
تلاش دل میں کسی در کی خاک چھانیں گے سنا ہے آج وہاں کوئی پاسبان نہیں
تمام خلق ہے حسنِ بتاں کی گِرویدہ پھر اور کیا ہے اگر یہ خدا کی شان نہیں
مکانِ گور کی پستی عجیب رفعت ہے
جو لامکاں بنے ایسا کوئی مکان نہیں

(III)

گھر میں صیّاد کے جب تک رہے آزاد رہے ہو کے آزاد تہِ دامنِ صیّاد رہے
میں وہ بلبل ہوں کروں دامِ محبت میں اسیر چار ہی روز میں صیّاد نہ صیّاد رہے
کوئی کہتا یہ گزرتا ہے ادھر سے ہر روز ہم رہیں یا نہ رہیں مے کدہ آباد رہے
لالے کا پھول بنے داغ بنے رنگ بنے دامنِ کوہ میں خونِ سرِ فرہاد رہے
ڈر سے محشر میں دمِ پرسشِ اعمال ریاضؔ
اس کی رحمت کے سوا کچھ نہ مجھے یاد رہے

معنی اور اشارے:

ہنگام نزع	موت کا وقت
گریہ	رونا پیٹنا، آہ وزاری
وضع	بناوٹ
دشنام	گالی گلوچ
مفلسی	غریبی
کاہش	کمی، گھٹاؤ
شیشہ وساغر	بوتل اور پیالہ
مہ وخورشید	چانداور سورج
پاسباں	پہرے دار، چوکیدار
خلق	مخلوق
گرویدہ	فریفتہ، عاشق
رفعت	بلندی، بزرگی
گور	قبر
صیّاد	شکاری
تہِ دامن	دامن کے نیچے
دامِ محبت	محبت کا جال
اسیر	قید، گرفتار
کوہ	پہاڑ

محشر	میدان قیامت
پرسش	پوچھ گچھ

معروضی سوالات:

1۔ ان میں سے خمریات کا شاعر کون ہے؟

(i) آتشؔ (ii) میرؔ

(iii) غالبؔ (iv) ریاضؔ

2۔ ریاض خیرآبادی کا سنِ پیدائش ہے۔

(i) 1853 (ii) 1856

(iii) 1860 (iv) 1850

3۔ ہنگام نزع گریہ یہاں بے کسی کا تھا

تم ہنس پڑے یہ وقت بھلا کیا ہنسی کا تھا

مندرجہ بالا شعر کے خالق کون ہیں۔

(i) ناسخؔ (ii) ریاضؔ

(iii) داغؔ (iv) آتشؔ

4۔ میں وہ بلبل ہوں کروں دامِ محبت میں اسیر

چار ہی روز میں صیّاد نہ صیّاد رہے

(i) حسن تعلیل (ii) تشبیہ

(iii) تلمیح (iv) استعارہ

5۔ ''ہمارے شیشہ وساغر ہیں یہ مہ وخورشید'' دوسرا مصرع کیا ہے۔

(i) یہ بات کیا ہے کسی کے بھی آنکھ کان نہیں
(ii) سنا ہے آج وہاں کوئی پاس بان نہیں
(iii) پھر اور کیا ہے اگر یہ خدا کی شان نہیں
(iv) ہمارے پینے کا اک خم ہے آسمان نہیں

مختصر ترین سوالات:

1۔ نیچے لکھے الفاظ کے ضد لکھیے۔

خورشید، اسیر، صیاد، رفعت، خلق، ازل

2۔ ریاض خیر آبادی کا انتقال کب ہوا؟

3۔ ریاض خیر آبادی کے استاد کا نام لکھیے۔

مختصر سوالات:

1۔ صنعت استعارہ کی تعریف مع مثال کیجیے۔

2۔ ریاض خیر آبادی کی خمریاتی شاعری پر نوٹ لکھیے۔

تفصیلی سوالات:

1۔ ریاض خیر آبادی کی شعری خصوصیات بیان کیجیے۔

2۔ ریاض خیر آبادی کے حالات زندگی اور ادبی خدمات کو پیش کریں۔

3۔ درج ذیل اشعار کی تشریح مع سیاق وسباق کریں۔

ازل میں دیکھ چکے سن چکے مگر پھر بھی
یہ بات کیا ہے کسی کے بھی آنکھ کان نہیں

لالے کا پھول بنے داغ بنے رنگ بنے
دامنِ کوہ میں خونِ سرِ فرہاد رہے

(7)

حسرت موہانی

[پیدائش 1875ء، وفات 1951ء]

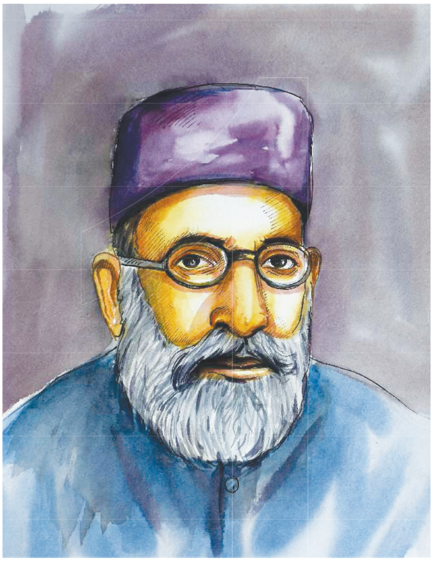

سید فضل الحسن نام اور حسرتؔ تخلص اتر پردیش کے ضلع انّاو کے قصبہ موہان میں 1875ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ علی گڑھ، لکھنؤ اور کانپور میں گزرا۔ اردو، عربی، فارسی کی تعلیم گھر پر حاصل کی اور انگریزی تعلیم کے لیے اسکول میں داخل ہو گئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ حسرت شاعر اور عالم ہونے کے ساتھ ساتھ سیاست داں بھی تھے۔ حسرت کو نہ تو انگریزوں سے اور نہ ہی انگریزی تہذیب سے کوئی اُنس تھا۔ پورے طور پر مشرقی تہذیب و تمدن کے علم بردار تھے۔ 1929ء میں ''انقلاب زندہ باد'' کا نعرہ دینے والے جنگ آزادی کے سپاہی حسرت موہانی ہی تھے۔ 1908ء میں رسالہ اُردوئے معلّٰی میں انگریزوں کے خلاف ایک مضمون شائع ہونے پر جیل بھیج دیے

گئے۔اس کے بعد 1947ء تک کئی بار قید اور رہا ہوئے۔ان کا انتقال 1951ء میں لکھنؤ میں ہوا اور وہیں دفن کیے گئے۔

مولانا حسرت موہانی نے ادب کی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔لیکن ان کی شاعری کو ایسی شہرت ملی کہ ان کے دوسرے ادبی کارنامے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔اصل میں حسرت ایک اعلیٰ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ممتاز صحافی، رہبر، نقاد اور ایک بلند پایہ تذکرہ نگار بھی تھے۔حسرت نے غزل کو ایک نئی زندگی اور توانائی بخشی۔غزل کو حقیقت اور فطرت کا آئینہ بنایا۔حسرت نے عشق، محبت کے تمام واقعات اور کیفیات بیان کیے۔لباس کی خوشبو، چلنے کی کیفیت، سینے کی مہک، دانتوں میں انگلی دبانا، ننگے پاؤں کوٹھے پر آنا، یہ باتیں نئی نہیں ہیں اور نہ ہی غیر معمولی مگر حسرت نے جس ندرت اور خوش اسلوبی سے ان تمام باتوں کو پیش کر دیا ہے وہ نئی معلوم ہوتی ہیں۔حسرت کے کلام کی سب سے اہم خوبی تغزل ہے۔ معاملہ بندی میں حسرتؔ، مومنؔ اور غالبؔ سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ان کے اشعار میں ہوسناکی کی لذیذ اور شیریں لہریں ملتی ہیں جو خوشگوار بھی ہیں اور غزل کی روایت سے لگّا بھی کھاتی ہیں۔حسرت نے قدیم روایات کا احترام کر کے اردو غزل کو نئی زندگی دی ہے۔حسرت کے یہاں رواداری، اضطراب و بے چینی ہے مگر وہ جذبات کی رو میں آ کر ضبط کا دامن نہیں چھوڑتے ہیں۔حسرت نے شاعری میں محبوب کی تمام کیفیتوں کو بڑی نزاکت اور خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ان کے اشعار میں ایک چلتے پھرتے محبوب کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔حسرت نے اپنی شاعری میں حسن و عشق کے علاوہ تصوف کو بھی جگہ دی ہے۔انھوں نے نظمیں بھی کہیں مگر ان کی شہرت غزلوں کی وجہ سے ہوئی۔

(I)

سرگرمِ ناز آپ کی شانِ جفا ہے کیا　　باقی ستم کا اور ابھی حوصلا ہے کیا

گر جوشِ آرزو کی ہیں کیفیتیں یہی　　میں بھول جاؤں گا کہ مرا مدّعا ہے کیا

اک برق مضطرب ہے کہ اک سحر بے قرار　　کچھ پوچھیے نہ وہ نگہِ فتنہ زا ہے کیا

چل بھی دیے وہ چھین کے صبر و قرارِ دل　　ہم سوچتے ہی رہ گئے یہ ماجرا ہے کیا

حسرت جفائے یار کو سمجھا جو تو وفا

آئینِ اشتیاق میں یہ بھی روا ہے کیا

(II)

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم　　گھبرا گئے ہیں بے دلی ہم زباں سے ہم

کچھ ایسی دور بھی تو نہیں منزلِ مراد　　لیکن یہ جب کہ چھوٹ چلیں کارواں سے ہم

معلوم سب ہے پوچھتے ہو پھر بھی مدّعا　　اب تم سے دل کی بات کہیں کس زباں سے ہم

مایوس بھی تو کرتے نہیں تم زراہِ ناز　　تنگ آ گئے ہیں کشمکشِ امتحاں سے ہم

ہے انتہائے یاس بھی اک ابتدائے شوق　　پھر آ گئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم

حسرتؔ پھر اور جا کے کریں کس کی بندگی

اچھا جو سر اٹھائیں بھی اس آستاں سے ہم

(III)

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

بے زبانی ترجمانِ شوقِ بے حد ہو تو ہو ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں

مٹ رہی ہیں دل سے یادیں روزگارِ عیش کی اب نظر کا ہے کو آئیں گی یہ تصویریں کہیں

التفاتِ یار تھا اک خوابِ آغازِ وفا سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

تیری بے صبری ہے حسرتؔ خام کاری کی دلیل
گریۂ عشاق میں ہوتی ہیں تاثیریں کہیں

معنی اور اشارے:

ناز	ادا، نخرہ
جفا	جور، ستم
مدعا	مقصد، مطلب
آئین	دستور، قانون
اشتیاق	آرزو، تمنّا
روا	درست
ہم زباں	ایک ہی زبان بولنے والے
مراد	مقصد
کشمکش	الجھن
یاس	نا اُمیدی
تدبیر	چارہ، درماں، طریقۂ علاج
تقدیر	قسمت، نصیب
ترجمان	مفسر

معروضی سوالات:

1۔ شاعر سید فضل الحسن کا تخلص کیا تھا؟

(i) حسرت (ii) جگر

(iii) مومن (iv) فراق

2۔ حسرت موہانی کی پیدائش ہندوستان کے کس صوبہ میں ہوئی ؟

(i) اتر پردیش (ii) بہار

(iii) گجرات (iv) بنگال

3۔ حسرت نے جس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اس کا نام ہے:

(i) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (ii) بنارس ہندو یونیورسٹی

(iii) الہ آباد یونیورسٹی (iv) اس میں سے کوئی نہیں۔

4۔ 'انقلاب زندہ باد' کا نعرہ کس نے دیا؟

(i) حسرت موہانی (ii) جگر مرادآبادی

(iii) فراق گورکھپوری (iv) اصغر گونڈوی

5۔ حسرت موہانی کو انگریزوں نے پہلی بار کس سنہ میں گرفتار کر کے جیل بھیجا؟

(i) 1908ء (ii) 1909ء

(iii) 1911ء (iv) 1913ء

مختصر ترین سوالات:

1۔ حسرت موہانی نے انقلاب زندہ آباد کا نعرہ کس سنہ میں دیا؟

2۔ حسرت موہانی کو کس صنف کے سبب شہرت حاصل ہوئی ؟

مختصر سوالات:

1۔ حسرت موہانی نے ابتدائی تعلیم کہاں حاصل کی؟

2۔ حسرت موہانی مغربی اور مشرقی تہذیب میں سے کس کے پیرو کار تھے؟

تفصیلی سوالات:

1۔ حسرت موہانی کے حالاتِ زندگی پر مختصر نوٹ لکھیے۔

2۔ حسرت موہانی کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

(8)

جگر مرادآبادی

[پیدائش 1890ء، وفات 1960ء]

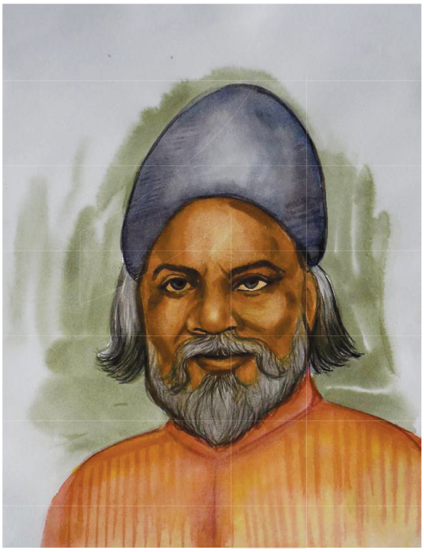

جگر مرادآبادی کی پیدائش 1890ء میں مرادآباد میں ہوئی لیکن خود جگر کا بیان ہے کہ وہ بنارس میں پیدا ہوئے اور چھ ماہ تک بنارس میں رہنے کے بعد مرادآباد آ گئے۔ جگر کے آباء واجداد کا وطن دہلی تھا۔ جگر کے مورثِ اعلیٰ مولوی محمد سمیع صاحب شہنشاہ شاہ جہاں کے اتالیق تھے۔ جگر کا پورا نام علی سکندر تھا۔ والد کا نام محمد علی نظرؔ، دادا کا نام امجد علی اور پردادا کا نام حافظ نور محمد تھا۔ یہ تینوں لوگ شاعر تھے۔ جگر کو ذوق شاعری ورثہ میں ملا تھا۔ جگر نے اردو، فارسی اور قرآنِ کریم کی تعلیم گھر پر ہی مولانا محمد صدیق سے حاصل کی۔ جگر کے والد مولانا محمد صدیق سے خصوصی عقیدت رکھتے تھے۔ جگر کی ابتدائی تعلیم وتربیت میں روحانی فیوض وبرکات بھی شامل تھے جن کا اثر ان کی تمام زندگی پر رہا۔ اس کے بعد اپنے والد علی محمد نظر سے بھی

اردو اور فارسی پڑھی۔ جگر نے اردو، فارسی، عربی کے بعد انگریزی کی بھی تعلیم حاصل کی مگر نویں جماعت تک پہونچتے پہونچتے اسے چھوڑ دیا۔ انھوں نے خود کو حضرت اصغر گونڈوی سے روحانی طور پر منسلک کرلیا اور انھیں کے فیض سے اپنی شخصیت اور سیرت کی تعمیر کی۔ لڑکپن سے ہی وہ شعر کہنے لگے تھے۔ ابتدا میں انھوں نے اپنے کلام پر والد سے اور بعد میں داغؔ دہلوی اور تسلیم سے اصلاح لی۔

جگر کے تین مجموعۂ کلام ہیں: ا۔ داغ جگر، ۲۔ شعلہ طور، اور ۳۔ آتش گل۔

آتش گل پر جگر مرادآبادی کو ساہتیہ اکادمی کا انعام ملا۔ ان کا انتقال 1960ء میں گونڈہ میں ہوا۔ جگرؔ کا شمار جدید دور کے بلند پایہ شعراء جگر، فانیؔ، حسرتؔ، اور اصغرؔ کے ہوتا ہے۔ جگر بھی ان شعرا کی طرح ترقی پسند تحریک سے قطعی متاثر نہیں ہوئے اور اردو غزل سنوارنے میں ہی لگے رہے۔ جگر کے کلام پر داغ کا زیادہ اثر ہے۔ ان کے کلام میں تصوف، اخلاق، شراب وشباب، غم دوراں کے شکوے وغیرہ نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ جگر کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ان کے جذبات اور الفاظ باہمی کا ترنم ہے جس کی کیفیت ذہن بھی محسوس کرتا ہے۔ جگر شاعرِ فطرت ہیں اور ذرّے ذرّے میں روح بن کر سما جانے کے فن سے واقف ہیں۔ جگر کی غزل میں فطری حسن ہے۔ اصغرؔ کی صحبت اور ان کے کلام کا جو اثر جگر کے کلام پر پڑا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ جگر اصغرؔ کے شاگرد تھے۔ جگر کے کلام میں فارسی تراکیب کے ساتھ نازکی، لطافت، تغزل، معاملہ بندی، بےخودی اور والہانہ پن بھی موجود ہے۔ متانت، دلکشی، رنگینی اور پختگی یہ خوبیاں ان کے کلام میں جابجا ہیں۔